ہفت روزہ

خدام الدین

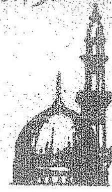
لاہور

پاکستان



زکوٰۃ

"جس شخص نے مال کی زکوٰۃ
ادا نہیں کی، قیامت میں اس کا مال
ایک زہریلا اژدہا بنا کر اس کے گلے میں
ڈالا جائے گا جو اس کو کاٹتا
رہے گا اور یہ کہ کر ڈسیگا
کہ میں تیرا مال ہوں،
تیرا خزانہ ہوں"
(حدیث)



احادیث الرسولؐ

دین کے اہم کام —— نماز اور جہاد

ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ۔

ترجمہ: اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ کیا میں تجھے نیک عمل کی جڑ، ستون اور اس کی چوٹی کی چیز سے مطلع نہ کر دوں؟ میں نے عرض کیا۔ ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا نیک عمل کی جڑ اسلام ہے اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی کی چیز جہاد ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آنحضرتؐ خود ہی فرماتے ہیں کیا میں تجھے نیک عمل کی جڑ، اس کا ستون اور اس کی چوٹی بھی نہ بتلا دوں! پھر آپ نے فرمایا نیکی کی مثال ایک عمارت کی سی ہے۔ جس کی بنیاد بھی ہے، ستون بھی اور چھت بھی ہے۔ جو شخص عمارت تعمیر کرتا ہے تو اس کی بنیادیں پختہ رکھتا ہے، اس کے ستون مضبوط بناتا ہے اور چھت بھی اچھی ڈالتا ہے، اس کی عمارت پائیدار ہوتی ہے اسی طرح اسلام کی بنیاد بھی ہے، ستون بھی ہیں اور چھت بھی۔ جس کی پختگی سے اسلام پختہ ہوتا ہے۔ اللہ کے سچے رستے کی جڑ اسلام ہے، یعنی اللہ کا، اس کے نبیوں، کتابوں اور یوم آخر کا زبان سے اقرار کرنا۔

مسلمان اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کی تعلیمات، اللہ کی کتابوں کے احکام اور آخرت کی بازپرس کے خوف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کو سچے اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے اعمال کی جڑیں اور بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اس بنیاد پر عمارت قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط ستون کی ضرورت ہے اور یہ ستون نماز ہے۔ مسلمان نماز کا پابند ہو کر اجتماعی زندگی کے سنوارنے میں مدد دیتا ہے۔ نماز قائم کرنے سے قوم کے روگ، بیماریاں اور نقائص دور ہوتے ہیں۔ نئی روح، نئی زندگی، نیا جوش پیدا ہوتا ہے۔

اب اس عمارت کو مکمل کرنے یعنی دین کے کمالات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ جہاد ہے یعنی قوم کی زندگی کو ہر پہلو سے مکمل کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد کرنا، دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینا اور جان و مال کی قربانی کے لیے ہر وقت تیار رہنا۔

یہ ہے اسلام کی عمارت کی بنیاد، اس کے ستون اور اس کی چھت۔

حضرت الامام مرشد درخواستی کے دورۂ گوجرانوالہ اور حضرت مولانا عبید اللہ انور کے دورہ واہ کی رپورٹیں نیز جامع مسجد شیرانوالہ میں قومی اتحاد کے فقید المثال جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال آئندہ ہفتہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بانی
شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی رح
***
رئیس الادارہ
شیخ طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور

ہفت روزہ
خدام الدین
لاہور

رئیس التحریر
مولانا مفتی محمود
***
مدیر
محمد سعید الرحمٰن علوی

جلد ۲۳ • شمارہ ۴ • ۱۲ رجب المرجب ۱۳۹۷ھ • یکم جولائی ۱۹۷۷ء • فی پرچہ : ایک روپیہ

ایاز قدرِ خود بشناس

بھٹو اور اس کی پارٹی زوال پذیر ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس بدیہی حقیقت کو دیکھنے کے باوصف کچھ لوگ "حق نمک" ادا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جن کا کئی دن سے مظاہرہ ہو رہا ہے۔

ہم اس وقت بھٹو صاحب کے "دو ملازموں" کے "فرمودات" کا جائزہ لیں گے جن میں سے ایک کا نام غلام مصطفیٰ کھر ہے اور دوسرے کا نام ڈاکٹر غلام حسین!

اول الذکر کے متعلق اس سے قبل ہم "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا" کے عنوان سے ادارتی کالموں میں اپنی معروضات پیش کر چکے ہیں مزید کچھ کہنا عبث ہے۔ تاہم بھٹو کے اس "لے پالک اور تازہ بہ تازہ سیاسی مشیر" نے اپنے دورۂ پشاور کے دوران پردہ کے پیچھے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان کا نوٹس لینا بہت ضروری ہے کھر نے باقی تو جو کہا سو کہا۔ ایک بات اس نے یہ کہی کہ:

"ہم چپہ چپہ پر اپنے مخالفین کا مقابلہ کریں گے"

اس پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بینڈکی کو زکام ہو گیا ہے۔

اس نے بھٹو کے مخالفین کو ختم کرنے کے لیے اس سے قبل جو کچھ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ اور وہ سوچتا ہے کہ میں اب بھی وہی کچھ کرونگا لیکن ہم مختصراً اتنا ہی کہیں گے کہ:۔

"انشاء اللہ تمہیں پنجاب کے کسی بھی شہر کے اندر عوام کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ یہ قوم تم سے تمہارے ایک ایک تاریک عمل کا حساب چکائے گی اور تمہیں بتلائے گی کہ تاج پورہ کی گراؤنڈ میں "نورا کشتی" کا مظاہرہ کر کے کس طرح قوم کے بچوں کو مروایا جاتا ہے؟ تم شوق سے بھٹو کی نوکری کرو۔ جتنے دن وہ ہے۔ لیکن اگر تم نے ماضی کے طور طریقے اپنانے کی کوشش کی تو یہ قوم تمہارے لیے قہر الٰہی ثابت ہوگی اور ایک ہی ریلے میں تمہیں بہا کر لے جائے گی۔"

دوسری ذات شریف جس کے متعلق ہمیں کچھ عرض کرنا ہے وہ ہے ڈاکٹر غلام حسین جو بد قسمت محکمہ ریلوے کا وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ پی، پی، پی کا جنرل سیکرٹری بھی ہے۔ منڈی بہاؤالدین کی پریکٹس چھوڑ کر کرسئ وزارت پر متمکن ہونے والا یہ بے اصول انسان آج فرضی اقتدار کے کھونٹے پر غرا رہا ہے اور اسے وہ دن بھول گئے ہیں۔ جب وہ کھر کے ساتھ پی۔پی۔پی سے علیحدہ ہو کر پنجاب مسلم لیگ کا آرگنائزر رہا تھا لیکن شاہ کے حساب کی تاب نہ لاکر بہت جلد "جاٹھے" والی منزل پر پہنچ گیا۔

اب وہ [illegible] چیپٹ فارم پر نہیں بلکہ [illegible] اور کہتا ہے کہ:

"اپوزیشن کے نعروں سے بعض لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام اور کفر کی جنگ نہیں بلکہ اقتدار کی جنگ ہے۔"

انہوں نے کہا کہ اپوزیشن والے اسلامی شریعت نافذ نہیں کر سکتے۔ صرف بھٹو ہی اسلامی شریعت نافذ کریں گے۔

"... انہوں نے کہا کہ کانگرسی مولویوں کا اسلام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اب انہوں نے ملک میں ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور حکومت کے خلاف تحریک میں ہلاک ہونے والوں کو شہادت کا درجہ دیا جا رہا ہے۔"

(نوائے وقت لاہور ۲۴ جون ۱۹۷۷ء)

آگے چل کر اس تقریر میں انہوں نے اپنے مخالفین کو "سزا" دینے کی بھی بات کی ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کو اس کے سوا اور کیا کہیں کہ:

"ایاز قدر خود بشناس"

جو لوگ آپ اور آپ کے چیئرمین کی ملک دشمن سرگرمیوں کے پیش نظر آپ کے مقابلہ میں آگئے ہیں وہ "گمراہ" اور جو شٹ پونجیے اور بزدل قوم و ملت کی آرزوؤں کے علی الرغم آپ سے چمٹے ہوئے ہیں وہ راہ راست پر؟

ببیں عقل و دانش باید گریست

اس "جنگ" میں ڈاکٹر صاحب کو محض اقتدار کی ہوس نظر آتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ کسی سے اقتدار لے کر کسی دوسرے کو دینے کے لیے اس انداز سے کوئی قربانی نہیں دیتا۔ قربانیاں ہمیشہ بلند تر مقاصد کے لیے دی جایا کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ جیسے کور چشموں کو نہ وہ مقصد نظر آئے اور نہ قربانیاں!

جہاں تک بھٹو کے اسلامی شریعت نافذ کرنے کا تعلق ہے۔ چھ سال میں ہم نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ حد ہے ڈھٹائی کی کہ اخلاق و شرافت، عدل و انصاف اور اسلامی و مشرقی اقدار کے ساتھ ساتھ ملک کے قاتل کو اسلام کا خادم کہا جائے؟

جہاں تک قابل صد احترام علماء کرام کو "کانگرسیت" کا طعنہ دینے کا تعلق ہے تو اس پر ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ علماء کرام نے آپ کے ممدوح کی طرح انگریز کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر ملک و ملت کا سودا نہیں کیا بلکہ اس گروہ حق نے بقول کسے

"ہم نے دشت سیاست میں اس وقت قدم رکھا تھا
جب سیاست کا آہنی زنجیریں تھیں"

یہ مسئلہ کہ حالیہ تحریک کے جانباز شہید ہیں یا نہیں؟ یہ مولویوں کا مسئلہ نہیں یہ خدائے علیم و خبیر کا ناطق فیصلہ ہے اس پر محمد عربی علیہ السلام کے ارشادات طیبات شاہد ہیں اور ہر سمجھ دار، ذی شعور اور صاحب علم و بصیرت اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔

آپ کے نزدیک وہ لوگ قابل قدر ہیں جنہوں نے آمریت کو سہارا دینے کے لیے لفنگے پن کا مظاہرہ کیا! اور وہ لوگ جو اسلام کی خاطر مردانہ وار گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے کھڑے ہو گئے وہ شہید نہیں؟

ڈاکٹر صاحب! عقل کے ناخن لو، ہوش سے کام لو اور بہکی بہکی باتیں مت کرو "سزا" دینے سے پہلے اپنی چمڑی کا حدود اربعہ معلوم کرو۔ اب اس ملک میں آپ جیسے لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ نظام شریعت اس ملک کا مقدر ہے اور اس کی راہ کو روکنے والے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

قبل اس کے کہ خدائے قہار و جبار آپ جیسے دشمنان دین و ملت کو حرف غلط کی طرح مٹا دے، خود ہی راہ راست پر آ جائیں اور خدائے قادر و توانا کی سخت گیری سے بچ جائیں۔

علوی

تبادلے کیوں؟

ہمیں مسلسل خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ نام نہاد وزرائے کرام مستقبل کے تحفظ کے لیے سرکاری ملازمین کے تبادلوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور دیانت دار ملازمین کو دور دراز علاقوں میں پھینکا جا رہا ہے۔

اس قسم کی خبریں دوسری جگہوں کے علاوہ سرگودھا کے ایک صوبائی وزیر کے متعلق بھی موصول ہوئی ہیں۔ جن کے حدود اربعہ سے ان سطور کا راقم اچھی طرح آگاہ ہے۔

خطبۂ جمعہ

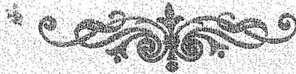
ضبط و ترتیب : علوی

انعاماتِ خداوندی

اور

ہمارے فرائض

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہم



بعد الحمد والصلوٰۃ :-

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ○

اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ ○ (صدق اللہ العلی العظیم)

قرآن کریم کی یہ سب سے چھوٹی اور مختصر سورت جس کا نام "الکوثر" ہے۔ تلاوت کی گئی۔ حضرت شیخ الہند رح کا ترجمہ نقل ہے :-

"بے شک ہم نے دی تجھ کو کوثر۔ سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر۔ بے شک جو دشمن ہے تیرا وہی رہ گیا پیچھا کٹا۔"

تقسیم مضامین

سورۃ مبارکہ کی تین چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں۔ پہلی آیت میں "کوثر" کے عطا کرنے کا ذکر ہے۔ دوسری میں نماز و قربانی کا اور تیسری میں اس بات کا کہ دم بریدگی کا داغ آپ کے دشمن کا مقدر ہے اور بس۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ پہلی آیت میں انعامات کا ذکر ہے، دوسری میں ذمہ داریوں اور فرائض کا ، اور تیسری میں انجام کا ۔

الکوثر

اصل مقصود اس وقت دوسری آیت کے متعلق کچھ کہنے سے ہے تاہم ضمناً پہلی اور تیسری آیت کا بھی ذکر کروں گا۔

پہلی آیت میں "کوثر" کے عطا کرنے کا ذکر ہے۔ کوثر کیا ہے؟ اس کے متعلق علامہ عثمانی قدس سرہٗ کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں :-

"کوثر کے معنی "خیر کثیر" کے ہیں۔ یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے؟ البحر المحیط (مشہور تفسیر) میں اس کے متعلق ۲۶ اقوال ذکر کئے ہیں اور اخیر میں اس کو ترجیح دی ہے کہ اس لفظ کے تحت میں ہر قسم کی دینی و دنیوی دولتیں اور حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں۔ جو آپ کو یا آپ کے طفیل میں امت مرحومہ کو ملنے والی تھیں۔ ان نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ "حوض کوثر" بھی ہے جو اسی نام سے مسلمانوں میں مشہور ہے اور جس کے پانی سے آپ اپنی امت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے"۔

بات بالکل واضح فرمادی کہ تمام نعمتیں اسی میں شامل ہیں اور یہ گویا صحیح اور راجح مفہوم ہے۔ ساتھ ہی مولانا مرحوم نے "تنبیہ" کے عنوان سے واضح فرما دیا ہے۔ کہ حوض کوثر کا ثبوت بعض محدثین کے نزدیک حد تواتر کو پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اس پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ احادیث میں اس کی عجیب و غریب خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔

پھر یہ کہ یہ نہر کہاں ہوگی؟ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بعض روایات میں اس کا میدان حشر میں اور اکثر میں جنت میں ہونا ثابت ہے۔

پھر فرمایا کہ ان دونوں قسم کی روایات میں علماء نے تطبیق بھی دی اور وہ یوں کہ:۔

"اصل نہر جنت میں ہوگی اور اس کا پانی میدان حشر میں لاکر کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا۔ دونوں کو کوثر ہی کہتے ہیں۔" واللہ اعلم بالصواب

فرائض اور ذمہ داریاں

دوسری آیت میں جیسا کہ عرض کیا۔ فرائض اور ذمہ داریوں کا ذکر ہے۔ اور وہ بالخصوص دو چیزیں ارشاد فرمائیں۔

نماز اور قربانی

اس موقعہ پر مولانا عثمانی رحمہ کے تشریحاتی نوٹ ملاحظہ فرمائیں پھر کچھ مزید عرض کروں گا۔

"یعنی اتنے بڑے انعام و احسان کا شکر بھی بہت بڑا ہونا چاہیے۔ تو چاہیے کہ آپ اپنی روح، بدن اور مال سے برابر اپنے رب کی عبادت میں لگے رہیں۔ بدنی و روحی عبادات میں سب سے بڑی چیز نماز ہے اور مالی عبادات میں قربانی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ قربانی کی اصل حقیقت جان کا قربان کرنا تھا۔ جانور کی قربانی کو بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے قصہ سے ظاہر ہے۔"

مولانا نے نماز و قربانی کے باہمی تعلق کے متعلق مزید یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:۔

"قرآن میں دوسری جگہ بھی نماز اور قربانی کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ ۔۔۔۔۔ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔"

اس حقیقت سے کون مسلمان ناواقف ہے کہ نماز دین کا اتنا اہم اور بنیادی رکن ہے کہ قرآن حکیم میں سینکڑوں مقامات پر اس کا ذکر ہے۔ حدیث پاک میں حضور علیہ السلام نے نماز کو مومن کی معراج اور اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک ارشاد فرمایا۔ مزید آپ نے کفر و اسلام کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز فرمائی۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

"جس نے ایک نماز جان بوجھ کر ترک کر دی۔ وہ کافر ہو گیا۔" (اعاذنا اللہ تعالیٰ)

فقہ کے چاروں مکاتب فکر بے نمازی کے متعلق سخت سزا کے قائل ہیں جن میں سے کمتر سزا حضرت الامام ابوحنیفہ قدس سرہ نے ذکر فرمائی۔ یعنی ہمیشہ کے لیے جیل۔ تاکہ یا تو وہ توبہ کر لے یا اسی حالت میں مر جائے۔

آپ غور فرمائیں کہ کتنا اہتمام ہے نماز کا لیکن پھر اس پر غور کریں کہ کتنے فیصد مسلمان اس فریضہ کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں؟ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ قیامت میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا۔

اب کسی کو احساس نہیں اور سب سے بڑھ کر حکومت مجرم ہے کہ اس کی ذمہ داریوں میں "اقامت صلوٰۃ" بھی شامل ہے جس کا ذکر سورۃ حج میں ہے۔ وہ نہ خود نماز پڑھتے ہیں نہ اقامت کا احساس و خیال ہے اور وہ مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

رہ گئی قربانی، تو قرآن نے سورۃ حج میں واضح فرما دیا ہے کہ یہ "عمل خیر" ہر امت میں موجود تھا۔ اور آج جس قربانی کے ہم مکلف ہیں وہ سنت خلیلی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ چونکہ نبی امی علیہ السلام کا حضرت خلیل علیہ السلام سے گہرا تعلق ہے اس لیے وہ عمل مبارک ہمیں بھی ورثہ میں ملا۔

ایک تو حضور علیہ السلام "دعوت ابراہیمی" کا مصداق

ہیں جیسا کہ آپؐ نے خود ارشاد فرمایا۔ پھر ہم بھی تو انہیں کی دعا کا فیض ہیں۔ اور انہوں نے ہی ہمارا نام مسلمان رکھا یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قربانی کا مقصد کیا ہے تو یہ بات حضرت مولانا عثمانیؒ کے ارشادات کے ضمن میں عرض ہو چکی کہ اصل مقصد تو

"جان کی قربانی ہے۔ جانور تو اس کا قائم مقام ہے۔"

اب بدبخت لوگ جانور کی قربانی پر اعتراض کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جان کا ہی مسئلہ ہوتا تو پھر؟ تو خدا کا احسان ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ جان و مال کی قربانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے "جنت" کا وعدہ ہے۔ فضل و کرم کا وعدہ ہے اور یہ سودا بڑا سستا ہے۔

بہر حال ایک مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ تمام فرائض خداوندی کو بجا لائے اور بالخصوص ان فرائض کو جن کو بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا۔ اس کے بغیر نہ انسانیت نہ بندگی ہے

بندہ آمد از برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

اور آپ یقین کریں کہ قربانی و صلاۃ سے بڑے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ انسان نماز کے ذریعہ برائیوں سے بچتا ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں اور جذبات قربانی سے ملت و قوم کو سہارا نصیب ہوتا ہے۔

انجام

جب فرائض صحیح طریق سے ادا کئے جائیں گے تو مالک کی طرف سے انجام سرخروئی و کامیابی کی صورت میں نکلے گا۔ اور دشمنی و مخالفت کرنے والے خائب و خاسر ہو جائیں گے۔

سنیں! مولانا عثمانیؒ کیا فرماتے ہیں:۔

"بعض کفار حضورؐ کی شان میں کہتے تھے کہ اس شخص کے کوئی بیٹا نہیں، بس زندگی تک اس کا نام ہے۔ پیچھے کون نام لے گا۔ ایسے شخص کو ان کے محاورات میں "ابتر" کہتے ہیں۔ "ابتر" اصل میں دُم کٹے جانور کو کہتے ہیں۔ جس کے پیچھے کوئی نام لینے والا نہ رہے گویا اس کی دُم کٹ گئی۔ قرآن نے بتایا کہ جس شخص کو اللہ "خیر کثیر" عنایت فرمائے اور ابدالآباد تک نام روشن کرے اسے "ابتر" کہنا پرلے درجے کی حماقت ہے حقیقت میں "ابتر" وہ ہے جو ایسی مقدس مقبول ہستی سے بغض و عناد اور عداوت رکھے اور اپنے پیچھے ذکر خیر اور اثر نیک نہ چھوڑے۔"

آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد (اب قریباً چودہ سو) ماشاء اللہ حضورؐ کی روحانی اولاد سے دنیا پٹی پڑی ہے اور جسمانی دختری اولاد بھی بکثرت ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپؐ کا دین، آپؐ کے آثار صالحہ عالم میں چمک رہے ہیں آپؐ کی یاد نیک نامی اور محبت و عقیدت کے ساتھ کروڑوں انسانوں کے دلوں کو گرما رہی ہے۔ دوست دشمن سب آپؐ کے اصلاحی کارناموں کا صدق دل سے اعتراف کر رہے ہیں۔ پھر دنیا سے گذر کر آخرت میں جس "مقام محمود" پر آپ کھڑے ہوں گے اور جو مقبولیت و متبوعیت عامہ آپ کو علیٰ رؤس الاشہاد حاصل ہوگی۔ وہ الگ رہی۔ کیا ایسی دائم البرکۃ ہستی کو العیاذ باللہ "ابتر" کہا جا سکتا ہے؟ اس کے مقابل اس گستاخ کو خیال کرو۔ جس نے یہ کلمہ زبان سے نکالا تھا، اس کا نام و نشان کہیں باقی نہیں۔ نہ آج بھلائی کے ساتھ اسے کوئی یاد کرنے والا ہے۔ یہی حال ان تمام گستاخوں کا ہوا جنہوں نے کسی زمانہ میں آپ کے بغض و عناد پر کمر باندھی اور آپؐ کی شان مبارک میں گستاخی کی اور اسی طرح آئندہ ہوتا رہے گا۔"

حضرت شیخ کے ارشادات اتنے واضح ہیں کہ اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں اور اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے۔

آج ہم اس مقدس پروگرام اور فرائض سے پہلو تہی کر کے محبت رسولؐ کا دعویٰ کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے، اسی کی وجہ سے ہم خراب ہو رہے ہیں۔

کامیابی اتباع رسولؐ میں ہے اور اتباع رسولؐ نام ہے فرائض خداوندی کے بجا لانے کا۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رئیس المجاہدین

مقبول جہانگیر

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر کی مردم خیز سرزمین میں مولانا خلیل اللہ کے گھر ایک فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی۔ والدین نے نومولود کا نام رحمت اللہ رکھا۔ بچے کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ماں نے یہ خواب دیکھا کہ کوئی عورت کہتی ہے: تیرے نام پر کیا چاند روشن ہوا ہے جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلے گی۔ اس خاندان میں صدیوں سے رشد و ہدایت اور علم و حکمت کا سلسلہ جاری تھا۔ طب، سیاست، شمشیر زنی، تصوف اور تعلیم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر اس خاندان کے افراد کے کارنامے جلی حروف میں نہ لکھے گئے ہوں۔ مغل دور کی تاریخیں ان کے حالات و کمالات سے بھری پڑی ہیں۔ دورِ اکبری کے طبیب حکیم [illegible] الملقب بہ شیخ الزماں اور ان کے بیٹے مقرب خاں کا نام نامی [illegible] ہے۔ شجرہ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس خاندان کے جدِ اعلیٰ حضرت شیخ عبدالرحمٰن گازرونی غزنی سے سلطان کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ غزنوی لشکر میں شیخ کا عہدہ قاضی عسکر کا تھا۔ پانی پت کی فتح کے بعد یہ سلطان کی اجازت سے اس قصبے میں مقیم ہوئے اور شاہی فرمان کے ذریعے پانی پت کا علاقہ آپ کی تحویل میں دیا گیا۔ شیخ عبدالرحمٰن کا مزار آج بھی پانی پت میں قلعے کے نیچے موجود ہے۔

مولانا خلیل اللہ کا یہ نومولود فرزند واقعی اللہ کی رحمت ثابت ہوا۔ آغازِ طفولیت ہی میں اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا تھا۔ بارہ برس کی عمر تھی کہ فارسی کی تمام درسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر علم کی پیاس بجھانے کے لیے شاہجہان آباد کا رخ کیا اور مدرسہ مولوی حیات میں ٹھہر کر مولانا حیات سے درس لینا شروع کیا۔ ۱۲۵۰ ہجری میں رحمت اللہ کے والدِ ماجد مولانا خلیل اللہ، راجہ ہندو راؤ بہادر (دہلی) کے ہاں پیش کار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ والد ماجد کے دہلی آنے کے بعد رحمت اللہ انہی کے ساتھ رہنے لگے۔ دن میں مدرسہ حیات میں تعلیم پاتے، شب کو اکبر نامہ راجہ ہندو راؤ کو سناتے۔ والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے خطوط نویسی کے فرائض بھی اسی عمر میں سنبھال لیے تھے۔ اس کام کو رحمت اللہ نے انتہائی لیاقت اور ذمہ داری سے سرانجام دیا جس پر راجہ نے خوش ہو کر ان کی بھی تنخواہ مقرر کر دی۔ لیکن بہت جلد اس کام سے طبیعت اکتا گئی اور طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ تحصیلِ علم کے لیے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں مفتی سعد اللہ مراد آبادی سے مسلم الثبوت اور میر زاہد پڑھی۔ اس کے بعد اپنے وطن کیرانہ چلے آئے۔ یہاں مولانا علی احمد صاحب سے تعلیم پاتے رہے۔ چند روز بعد پھر دہلی کی طرف رختِ سفر باندھا اور اس مرتبہ جی کھول کر علمی پیاس بجھائی۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن چشتی سے ابتدائی علوم عربی، مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی، حکیم فیض محمد صاحب سے طب اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے صحاحِ ستہ کی تکمیل کی۔

تیئس برس کی عمر میں شادی ہو گئی۔ اب ضرورت تھی کہ معاش کا کوئی مستقل انتظام ہو۔ اتفاق سے راجہ ہندو راؤ نے اپنے پاس بلوا لیا اور میر منشی کا عہدہ دیا۔ اسی دوران میں مولانا کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور بعض خانگی مجبوریوں کے باعث مولانا نے راجہ کے ہاں اپنے چھوٹے بھائی محمد جلیل صاحب کو رکھوا کر خود علیحدگی اختیار کر لی۔ دلّی سے کیرانہ پہنچے اور یہاں کی ایک مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب [illegible] برصغیر پاک و ہند میں اسلامی شان و شوکت اور سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شاہانِ مغلیہ کی آخری یادگار، بہادر شاہ ظفر زوالِ سلطنت کا پُرحسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دریائے جمنا کی پُرسکون لہروں میں انقلابِ زمانہ کی نیرنگیاں بہہ رہی تھیں۔ اغیار کی ریشہ دوانیوں کی کوئی تدبیر بہادر شاہ ظفر کے پاس نہ تھی اور انگریزی رسوخ و اقتدار کا سیلاب لال قلعے کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس پُرآشوب آواز سے بادشاہ خوفزدہ تھا۔ اس دورِ پُرفتن کے نازک حالات نے مولانا کو اس کا موقع نہ دیا کہ اطمینان و سکون سے تدریس کا فیض جاری رکھتے۔ انگریز پادری بڑی کثرت سے برصغیر میں آ رہے تھے اور چونکہ مسلمان اقتصادی طور پر بدحال تھے اور دین کی تعلیم بھی واجبی سی تھی، اس لیے انہیں گمراہ کرنے کا نادر موقع پادریوں کے ہاتھ آیا تھا۔ گلی گلی، کوچے کوچے پادری عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پھیل گئے۔ اپنے مذہب کی نشر و اشاعت کے لیے انہوں نے لاتعداد کتابیں اردو زبان میں شائع کرنی شروع کر دی تھیں جس میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر رکیک اور نارو حملے کیے جاتے۔ مولانا رحمت اللہ نے بھی دینی غیرت و حمیت سے مجبور ہو کر قلم اٹھایا اور اپنے محترم و مکرم استاد حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کی فرمائش پر ردِ نصاریٰ میں ایک کتاب "ازالۃ الاوہام" کی تالیف میں مصروف ہوئے۔ ابھی یہ کتاب لکھی جا رہی تھی کہ مولانا اچانک تپ و لرزہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مرض یہاں تک بڑھا کہ طبیبوں نے علاج سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ انہیں دِق ہو گئی اور اب ان کا جانبر ہونا محال ہے۔

چارپائی پر لیٹے لیٹے نماز پڑھ رہے تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئے، تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے ان کے بھائی حکیم علی اکبر نے سمجھا کہ شاید اپنی زندگی سے مایوس ہو کر رو رہے ہیں۔ یہ بھانپ کر مولانا رحمت اللہ نے فرمایا:۔" انشاء اللہ میں تندرست ہو جاؤں گا۔ میرے رونے کا سبب زندگی سے مایوسی نہیں بلکہ یہ ہے کہ ابھی ابھی میں نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سمیت تشریف لائے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں" رئیس المجاہدین یا رئیس العالجین۔" اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔ "اے جوان خوشخبری ہو کہ تیرے حق میں رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا۔۔۔۔" اگرچہ بظاہر میری تالیف ازالۃ الاوہام مرض کا باعث بنی ہے۔ لیکن یقین ہے کہ یہی شفا کا سبب بھی بنے گی۔" اور ایسا ہی ہوا۔ اس مبارک خواب کے بعد مولانا رحمت اللہ روز بروز صحت یاب ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے شفائے کلی عطا فرمائی اس اثنا میں ازالۃ الاوہام کے جو اوراق منتشر ہو گئے تھے۔ آپ نے انہیں دوبارہ مرتب کیا۔

اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ہی دلی کے علمی حلقوں میں اس کی بڑی شہرت ہو گئی تھی۔ اور اس کا جواب لکھنے کی ماسٹر رام جیسے نصرانی فاضل لوگ تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مولانا نے مناسب سمجھا کہ کتاب کا مسودہ کسی لائق اور فاضل عالم کو بھی دکھا لیا جائے، تاکہ اس میں جو سقم ہوں وہ دور ہو جائیں نظر انتخاب حضرت مولانا نور الحسن پر پڑی جو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی خاتم مثنوی کے پوتے تھے۔ مولانا نور الحسن نے اس کتاب کو بے حد پسند اور مفید سمجھا۔ اور مولانا رحمت اللہ کو اجازت عطا کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اسے چھپوایا جائے۔ پانچسو چونسٹھ صفحات پر مشتمل یہ کتاب آخر ۱۲۶۹ھ میں دلی سے شائع ہو گئی۔ اس کے دیباچے میں مولانا رحمت اللہ نے لکھا۔

یہ کتاب پہلے میں نے اردو میں لکھی تھی۔ لیکن اہل اسلام کے اہل علم فارسی زبان سے زیادہ رغبت رکھتے تھے، اس لئے مجبوراً ان کے اصرار پر اس کو فارسی زبان میں تبدیل کیا۔" اس کتاب میں پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کے ان تمام اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے جو اس نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر کئے تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماءؒ کی رائے اس کتاب کے بارے میں یہ ہے کہ اس کو چھپے ہوئے ۲۷ برس ہو چکے ہیں، لیکن آج تک کسی عیسائی عالم نے ایک مبحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا۔

انہی ایام میں مولانا رحمت اللہ اپنی کتاب ازالۃ الاوہام کی طباعت کے ارادے سے دہلی پہنچے، وہاں ان کی ملاقات آگرے کے ڈاکٹر وزیر خاں سے ہوئی۔ وزیر خاں اعلیٰ پائے کے سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ دین حق کی اشاعت و تبلیغ کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ اتفاق سے پادری فنڈر بھی کچھ عرصے کے لیے آگرے پہنچ گیا تھا۔ اور شہر کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر علی الاعلان کہتا تھا، کہ ہے کوئی مرد مسلمان جو ہماری کتاب میزان الحق کا جواب دے، اور ہم نے جو اعتراضات اسلام پر کیے ہیں ان کا رد کرے، ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ سے اس فتنے کا ذکر نہایت درد بھرے الفاظ میں کیا۔ اور مولانا کو آگرہ چلنے کی دعوت دی۔ مولانا نے دعوت منظور فرمائی اور آگرہ پہنچ کر سرائے جھلی میں ٹھہرے۔ مولانا کی آمد کی اطلاع بہت جلد شہر میں پھیل گئی اور بہت سے مسلمان وکلا، اور رئیس آپ کی ملاقات کو آئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے اعلان کر دیا کہ مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے مابین مناظرہ ہوگا۔ ڈاکٹر وزیر خاں انگریزی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اور جب یہ ڈاکٹری کی سند لینے انگلستان گئے تھے تو وہاں سے نصرانیوں کی بہت سی کتابیں ساتھ لائے تھے۔ ان دونوں نے پادریوں کو گھیر لیا اور ۱۸۵۴ء میں انہوں نے دو مناظرے کئے پہلا چھوٹا مناظرہ اکبر آباد اور دوسرا بڑا مناظرہ اکبر آباد کے نام سے مشہور ہے۔ ان مناظروں میں پادریوں کو شکست فاش ہوئی۔ پادری فنڈر کی علمیت کا سارا پول کھل گیا۔

اور وہ مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے سائے سے بھی بدکنے لگا۔ ان مناظروں سے مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ اور مسیحی مشنریوں کا غرور پاش پاش ہوا۔

مولانا رحمت اللہ کی کتب ردِ نصاریٰ کی تالیف جہاد بالقلم اور ۱۸۵۴ء میں آگرے کے مناظرے جو جہاد باللسان تھے، وہ جہاد بالسیف جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ دلّی کے علمی حلقوں اور لال قلعے کے شہزادوں پر مولانا رحمت اللہ کی علمی قابلیت اور ردِ نصاریٰ میں وسیع معلومات اور حضرت حاجی امداد اللہ کی بزرگی اور روحانیت کا بڑا اثر تھا۔ میرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر تو خاص طور پر ان دونوں حضرات کے نہایت معتقد تھے۔ مناظرہ اکبر آباد کے دوسرے فاتح ڈاکٹر وزیر خاں تھے اور اس مناظرے میں ان کا ساتھ دینے والوں میں مولانا فیض احمد رُسوا بدایونی بھی شامل تھے۔ ان حضرات کے یہ گہرے تعلقات ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ اور انہوں نے یک جان ہو کر اس جنگ میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ جب میرٹھ کے مجاہدین نے دلّی میں آزادی کا بگل بجایا تو یہ چاروں حضرات آگے بڑھے اور آزادی کی جنگ کا نقشہ بنانے اور اس پر عمل کرنے کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ شاملی اور کیرانے کا معرکہ بھی مولانا رحمت اللہ اور حاجی امداد اللہ صاحب نے باہمی مشوروں سے سر کیا۔ اور ان میں ہر شخص نے حتی الامکان جنگِ آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے آگرے میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر سے اختیارات طلب کیے۔ اس کا ذکر بھی روز نامچہ عبداللطیف خان میں ہے۔

اس تحریک کا آغاز یوں ہوا کہ جب میرٹھ کی باغی فوج دہلی میں پہنچی اور انگریزوں سے لڑائی ہونے لگی، تب ضلع مظفر نگر میں بھی آزادی کی چنگاریاں روشن ہوئیں۔ حاجی امداد اللہ نے اپنے ماتحتوں اور عقیدت مندوں سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا کہ ہمیں جہاد میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد کی مخالفت کی۔ اس پر مولانا قاسم نانوتویؒ نے کہا:۔ "کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں"۔ غرض حاجی صاحب نے سب کی باتیں سننے کے بعد کہا:۔ "الحمدللہ انشراحِ صدر ہو گیا۔ جہاد کی تیاری شروع کی جائے"۔ حاجی صاحب نے امامت قبول کی اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار بنائے گئے۔ معاون قاضی مولانا رشید احمد گنگوہی مقرر ہوئے اور یوں قصبہ تھانہ بھون دارالسلام قرار پایا۔ وہاں کے دو رئیسوں عبدالرحیم خان اور عنایت علی خاں نے جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ عبدالرحیم خان کو سہارنپور سے ہاتھی لانے کو کہا گیا تاکہ دہلی کی طرف کمک بھیجی جائے۔ عبدالرحیم خاں اپنے چند دوستوں کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس قیام کیا۔ کسی مخبر نے ضلعی حکام کے پاس ان کے اس مقصد سے آنے کی خبر پہنچا دی۔ چنانچہ پولیس آئی اور عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئی اور انہیں جیل میں ڈال دیا۔ چند روز بعد عبدالرحیم خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس واقعے سے تمام ضلعے میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ عنایت علی خاں کو جب چھوٹے بھائی کے پھانسی پا جانے کی اطلاع ملی تو غیظ و غضب سے دیوانے ہو گئے اور بھائی کا انتقام لینے کی نیت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتفاق کی بات انہی دنوں چند انگریز فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی پیٹیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے۔ عنایت علی خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر ان پر ٹوٹ پڑے سب کو قتل کر کے سامان لوٹ لیا۔ ایک سوار زخمی ہو کر بھاگا، مگر تھوڑے فاصلے پر گھوڑے سے گر کر

مر گیا۔ ل بغاوت کی طلاع مظفر نگر کے انگریز حکام تک پہنچی تو شاملی پر فوج لیکر آ گئے۔ لیکن انگریزی فوج کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی عنایت علی خاں اپنے جتھے سمیت نقارہ بجاتے ہوئے تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑے۔ اہل کاروں کو قتل کیا، خزانہ لوٹا اور غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ اتنے میں انگریزی فوج وہاں آگئی۔ خوب گھمسان کا رن پڑا جس میں عنایت علی خاں شہید ہو گئے۔ لیکن مجاہدین نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور انہیں دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ عنایت علی خاں اپنے قصبے کے معاملات اور قضیے طے کیا کرتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد لوگ حاجی امداد اللہ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی آپ قاضی بنیں اور عدالت کریں۔ یہ درخواست حاجی صاحب نے منظور فرمائی۔ آپ نے لوگوں کے سروں پر ہاتھ رکھا۔ اور دیوانی و فوجداری مقدمات شرعی حکم کے مطابق قاضی شرع بن کر فیصل فرمائے۔

ادھر انگریز بدلہ لینے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔ حاجی صاحب کے آدمیوں سے انگریزوں کی ہلکی بڑی جھڑپیں ہونے لگیں۔ حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقا کو کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ کیرانہ شاملی یا مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوتی، تو نہایت اطمینان کے ساتھ آتے جاتے۔ ان حضرات کے پاس ہر وقت اسلحہ رہتا۔ ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن اور مولانا قاسم نانوتوی کا انگریزی فوج سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ حضرات اٹل پہاڑ کی طرح پر اجما کر ڈٹ گئے۔ دیر تک مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں کہ حافظ ضامن کے زیر ناف گولی لگی۔ اور شہید ہو گئے۔ اسی طرح مولانا قاسم کے بھی گولی لگی اور سر کے بل گر بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ گولی کنپٹی پر لگی تھی۔ حاجی امداد اللہ نے آگے بڑھ کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: "کیا ہوا میاں؟" عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، تو گولی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ کہ خون سے مولانا قاسم کے تمام کپڑے رنگین تھے۔

ابھی یہ جھڑپیں جاری تھیں کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور یہ خبر بھی قصبے میں پہنچی کہ انگریزی فوج تھانہ بھون پہنچ رہی ہے۔ عوام یہ خبر سن کر دہشت زدہ ہوئے۔ اور سراسیمہ ہوئے۔ اور جوق در جوق تھانہ بھون سے روانہ ہو کر نجیب آباد کو چلے۔ اگلے روز علی الصبح تھانہ بھون کو سرکاری فوج نے گھیرے میں لے کر شرقی جانب سے گولہ باری شروع کر دی۔ دن نکلنے پر فوج قصبے میں داخل ہو گئی قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے۔ اور مکانوں کو آگ لگا دی گئی اس کس مپرسی کے عالم میں گرد و نواح کے دیہاتیوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ اس ظلم کے بعد قصبے میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ حاجی امداد اللہ، مولانا قاسم اور مولانا رشید احمد کے وارنٹ نکل گئے الزام یہ تھا کہ تھانہ بھون میں بغاوت کے بانی یہی لوگ تھے۔ اور شاملی تحصیل پر اسی گروہ نے حملہ کیا تھا۔ حاجی امداد اللہ دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تھانہ بھون سے نکل گئے۔ مہینوں ادھر اُدھر رہے۔ اور کسی طرح انگریزوں کے ہتھے نہ چڑھے آخر کار سندھ کے راستے کہ معظمہ پہنچے۔ اور وہیں سکونت اختیار کی۔ مولانا قاسم بھی ہاتھ نہ آئے، البتہ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوئے، چھ ماہ جیل میں رکھے گئے آخر ثبوت نہ ملنے پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اسیری کے یہ چھ مہینے مولانا گنگوہی نے مظفر نگر جیل میں کاٹے۔

کیرانہ کے لوگوں نے بھی شاملی تحصیل پر حملہ کرنے میں برابر کا حصہ لیا تھا اور کیرانہ کے اندر بھی انگریزی فوج سے ان لوگوں نے دو دو ہاتھ کئے تھے۔ ان میں مولانا رحمت اللہ، چودھری عظیم الدین، حکیم اکبر علی اور شیخ فرید عرف پیر جی فدو وغیرہ شامل تھے۔ کیرانہ کے مسلمان گوجروں کی قیادت چودھری عظیم الدین کے پاس تھی۔ انہوں نے ملک سر

کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجا کر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا" اس جملے کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا، لوگوں سے کہا جاتا۔

کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کے آثار نظر نہ آتے تھے، مگر یہاں بھی بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانہ میں انگریزی فوج داخل ہوئی۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپ خانہ نصب کر دیا گیا اور قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس ہنگامے میں شیخ حمید الدین عثمانی عرف بڈھو شہید ہو گئے۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو فرداً فرداً گھر سے نکالا گیا۔

مولانا رحمت اللہ پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے تحصیل شاملی کو لوٹنے میں حصہ لیا تھا۔ ان کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ مخبر نے اطلاع دی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ اس وقت آپ دربار والی مسجد کے بالائی حصے کی ایک کوٹھڑی میں جنوبی رخ تشریف فرما تھے۔ جب آپ کو فوج کے آنے کی خبر ملی تو آپ نے حجرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ مسجد میں آپ کے ساتھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ پنجیٹھ گاؤں پہنچے یہاں بھی آپ کی تلاش کے لیے بڑی تعداد میں فوج پہنچ گئی۔ اور گاؤں کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا، پھر فوجی افسروں نے گاؤں کے ذمہ دار لوگوں کو بلایا۔ اور حکم دیا کہ مولوی رحمت اللہ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ سارا گاؤں جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔ گاؤں والوں نے جواب دیا "ہم مولوی رحمت اللہ کو نہیں جانتے کون ہے اور نہ اس وقت یہاں موجود ہے"۔ فوجیوں نے ان کی بات کا اعتبار نہ کیا اور گاؤں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی گئی، لیکن مولانا کا پتہ نہ چلا۔

ہوا یہ کہ گاؤں کے مکھیا نے فوج آتے دیکھی، تو مولانا کو مشورہ دیا کہ وہ کھرپے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد انگریزی فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گزری۔ حضرت مولانا رحمت اللہ بعد میں اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے "میں گھاس کاٹ رہا تھا اور فوج کھیت کے قریب سے گزر رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں"۔ جب مولانا ہاتھ نہ آئے تو افسروں نے جھنجھلا کر اس گاؤں کے چودہ آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں مارتے پیٹتے اپنے ساتھ لے گئے ان کے رشتہ داروں کو دھمکیاں دیں۔ کہ اگر مولانا کا نشان پتہ نہ بتاؤ گے تو ان سب کو سولیوں پر لٹکا دیں گے۔ مولانا کے علم میں جب ان چودہ آدمیوں کے پکڑے جانے کی خبر آئی تو آپ نے چودھری عظیم الدین سے فرمایا "ان بے چاروں کو محض میری وجہ سے اذیت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اور مجھے یہ گوارا نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دوں تاکہ یہ بے گناہ رہا ہو جائیں۔ اور ان کے رشتے دار پریشانی سے بچیں"۔ مولانا کی یہ بات سن کر چودھری عظیم الدین نے جو جواب دیا وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس نے عرض کیا "مولوی صاحب یہ تو ۱۴ آدمی ہیں۔ اگر پورا گاؤں بھی گرفتار ہو کر پھانسی پر لٹکا دیا جائے تب بھی آپ کو فوج کے حوالے نہ کیا جائے گا"۔ یہ چودہ آدمی چھ ماہ گزرنے کے بعد جیل سے رہا کر دیئے گئے۔

جتنے دن مولانا اس گاؤں میں رہے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت اور تلقین کرتے رہے۔ ان کے عقائد اور اعمال کو بھی درست کیا۔ اس گاؤں کی میتیں کیرانہ میں دفن کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ اپنے گاؤں میں میت دفن کرنا برا جانتے تھے مولانا نے اس فاسد عقیدے کی

اصلاح کی اور انہیں سمجھایا کہ اپنی بیٹیں یہیں دفن کیا کرو۔ چودھری عظیم نے مولانا کو ایک روایت کے مطابق چھ سات روز اور دوسری روایت کے مطابق ایک ماہ تک چھپائے رکھا۔ اس گاؤں کے قریب اس زمانے میں جنگل ہی جنگل تھے۔ دن میں اکثر مولانا جنگل میں چلے جاتے اور رات کو گاؤں میں سہتے چودھری عظیم اس نازک اور پریشان کن دور میں ہر وقت مولانا کے ساتھ رہے۔ اور جب تک انہوں نے مولانا کو مکہ معظمہ جانے کے لیے بحری جہاز پر سوار نہیں کرا دیا، ان سے الگ نہ ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ کو انگریزی فوج تلاش بسیار کے باوجود گرفتار نہ کر سکی تو ان کی غیر حاضری میں مقدمہ چلایا۔ مفرور باغی قرار دے کر انہیں زندہ یا مردہ پیش کرنے والے کے لیے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ یاد رہے کہ اس زمانے کے ایک ہزار روپے آجکل کے کوئی ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوتے تھے۔

اس دورِ پُرفتن میں جب کہ شرفا کے لئے جائے اماں نہ تھی اور لوگ اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے ملک چھوڑ چھوڑ کر مکہ معظمہ جا رہے تھے اور علمائے ہند کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تو ہجرت فرما چکے تھے۔ کہ مولانا رحمت اللہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اپنا نام مصلح الدین رکھ کر ہجرت کے ارادے سے دہلی سے روانہ ہوئے جے پور اور جودھپور کے مہیب اور خطرناک صحرا پا پیادہ طے کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ سورت سے جہاز میں سوار ہو کر حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز چلا کرتے تھے۔ سورت سے جدے تک تین مہینوں میں سفر طے ہوتا تھا۔ سال بھر میں صرف ایک دو جہاز آیا جایا کرتے تھے۔ ایک خط کا محصول چار روپے تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادے سے ترکِ وطن کرتے تھے وہ دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق زندگی دل سے نکال دیا کرتے تھے۔

مولانا رحمت اللہ کی روانگی کے بعد آپ کے گھر والوں اور رشتے داروں پر آفت آئی۔ کیرانہ اور پانی پت میں مولانا کی اور ان کے قریبی رشتہ داروں کی جو جائیداد تھی وہ کمال الدین مخبر کی شناخت پر ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر ڈالی گئی۔ اس تمام جائیداد کی قیمت اس زمانے میں لاکھوں روپے تھی لیکن صرف ایک ہزار چار سو روپے کے عوض نیلام کر دی گئی۔

ایک طویل اور آلام و مصائب سے بھرے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے اللہ پر شاکر، توکل پہ تکیہ، صبر و رضا کے مجسمے اور سربکف مجاہدِ اسلام، مرکزِ دینِ مبین مکہ معظمہ پہنچے۔ حاجی امداد اللہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ طواف کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سعی میں بھی حاجی صاحب کے ساتھ شریک رہے۔ ان دو ارکان سے فارغ ہو کر یہ دونوں حضرات رباط داودیہ میں آئے۔ جہاں حاجی صاحب مقیم تھے۔ یہ زمانہ سلطان عبدالعزیز خاں کی خلافت کا تھا۔ اور مسجد حرم میں سید احمد دحلان شیخ العلماء کا حلقۂ درس مرجعِ خاص و عام تھا۔ امیرِ مکہ شریف عبداللہ بن عون محمد تھے۔

حجاز پہنچنے کے بعد مولانا اور حاجی صاحب یک جان دو قالب بن کر رہے۔ اور ان دونوں میں بڑی محبت، ایک دوسرے کے لیے تھی۔ مولانا رحمت اللہ اکثر حرم میں حاضر ہوتے اور سید احمد دحلان کے درس میں بیٹھتے۔ سید صاحب شافعی المذہب تھے۔ ایک روز سبق کے دوران میں کسی مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے شافعی مذہب کی ترجیح کے ساتھ دلائل احناف کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ درس ختم ہونے کے بعد مولانا رحمت اللہ پہلی مرتبہ سید احمد دحلان سے ملے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے اس مسئلے کے بارے میں اپنی تشفی چاہی دونوں میں تھوڑی دیر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اور سید صاحب کو اندازہ

ہوگیا کہ یہ شخص کوئی عام طالب علم نہیں ہے۔ انہوں نے مولانا سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟" "کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مولانا نے نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کرایا۔ سید احمد دحلان نے ازراہ تواضع دوسرے روز مولانا کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ اگلے دن آپ حاجی امداد اللہ کے ساتھ سید احمد دحلان کے دولت کدے پر تشریف لے گئے اور مولانا نے حاجی صاحب کا تعارف سید صاحب سے کرایا اور ۱۸۵۷ء کے تمام واقعات بیان کئے۔ سید احمد دحلان اٹھ کر ان دونوں اصحاب سے بغل گیر ہوئے۔ اور بے حد تعظیم و تکریم کا اظہار فرمایا۔ اسی ملاقات میں سید احمد دحلان نے مولانا رحمت اللہ کو حرم شریف میں درس کی اجازت دی اور علمائے مسجد حرم کے دفتر میں آپ کا نام درج کرایا۔

انہی دنوں وہی پادری فنڈر جس نے مناظرہ اکبرآباد میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں سے شکست فاش کھائی تھی، انگلستان سے پھرتا قسطنطنیہ پہنچا۔ اس زمانے میں انگلستان اور ترکی کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے پادری فنڈر کی ملاقات خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز خاں سے ہوئی اور اس نے نہایت ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے کہا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مناظرہ ہوا تھا جس میں عیسائیت کی فتح اور اسلام کی شکست ہوئی تھی۔ علمائے اسلام لاجواب ہوئے جس کی وجہ سے ہندوستان میں دھڑا دھڑ مسلمان دین مسیحی قبول کر رہے ہیں۔

سلطان عبدالعزیز خاں کو پادری فنڈر کی ان مبالغہ آمیز باتوں سے بڑی تشویش ہوئی اور جی چاہا کہ ان دعووں کی اصلیت معلوم کی جائے چنانچہ سلطان نے اسی وقت شریف مکہ کے نام فرمان جاری کیا کہ حج کے زمانے میں ہندوستان سے جو علماء اور باخبر و معتبر اصحاب آئیں ان سے پادری فنڈر کے مناظروں اور ۱۸۵۷ء کی گڑبڑ کے حالات معلوم کر کے ہمیں مطلع کیا جائے۔ امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے اس فرمانِ سلطانی کا ذکر کیا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ جس عالم سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا تھا۔ وہ عالم خود یہاں تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ اگلے روز سید احمد دحلان، مولانا رحمت اللہ کو اپنے ساتھ لے کر امیر مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کے بعد امیر مکہ نے فوراً سلطان عبدالعزیز خاں کو سارے حالات لکھ کر بھیج دیئے ادھر سے دوسرا فرمان آیا کہ مولانا کو بصد اعزاز و اکرام شاہی مہمان کی حیثیت سے قسطنطنیہ روانہ کرو۔ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہنچے۔ سلطان عبدالعزیز خاں بکمال التفاتِ شاہانہ روزانہ آپ کو بعد نماز عشا شرفِ باریابی عطا فرماتے۔ اس مخصوص صحبت میں اکثر خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابر سلطنت بھی شریک ہوتے۔ جب پادری فنڈر کو پتہ چلا کہ مولانا رحمت اللہ یہاں پہنچ گئے ہیں اور شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیم ہیں تو اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور وہ اسی وقت اپنا بوریا بستر باندھ کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ سلطان عبدالعزیز خاں نے مولانا سے ان ملاقاتوں میں مناظرۂ اکبرآباد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تمام حالات نہایت دلچسپی سے سنے اور یہ جان کر بے حد خوش ہوئے کہ پادری فنڈر نے جو دعوے کئے تھے ان کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ سلطان نے مولانا کی اس جلیل القدر دینی خدمت کی یہ قدر افزائی کی کہ رخصت کے وقت خلعت فاخرہ کے ساتھ تمغۂ مجیدی درجۂ دوم اور گرانقدر وظیفے سے سرفراز کیا۔

مولانا سے ملاقات کے بعد سلطان عبدالعزیز خاں نے ترکی میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں روکنے کے لیے سخت قدم اٹھائے۔

سلطان عبدالعزیز خاں کی خواہش اور خیرالدین پاشا کی تحریک پر مولانا نے انہی دنوں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اظہار الحق" عربی زبان میں لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کی تصنیف و ترتیب میں چھ ماہ کا قلیل عرصہ لگا۔ مولانا کی ژرف نگاہی، علمی قابلیت اور حافظہ کا بے نظیر نمونہ یہ کتاب ہے۔ کتاب کے مقدمے میں مولانا نے سلطان عبدالعزیز

خاں کا ذکر کرنے کے بجائے شیخ العلماء سید احمد دحلان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ انہی کے حکم اور فرمائش پر یہ کتاب لکھی گئی ہے یہ مقدمہ دیکھ کر خیر الدین پاشا نے مولانا سے کہا :-

"آپ نے امیر المومنین کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی ہے۔ لیکن مقدمے میں شیخ العلماء سید احمد دحلان کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ ان کی جگہ امیر المومنین سلطان عبد العزیز خاں کا نام آنا چاہیئے تھا۔" مولانا رحمت اللہ نے بلا جھجک یہ جواب دیا :- "اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض کا کوئی شائبہ نہ آنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مکہ معظمہ میں خود شیخ العلماء مجھ سے ان حالات کے قلمبند کرنے کی خواہش کر چکے تھے۔ اور میں نے ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب شیخ العلماء ہیں۔ کسی وجہ سے اگر وہ مجھے امیر مکہ تک نہ پہنچاتے تو امیر المومنین عبد العزیز خاں تک میری رسائی کیسے ہوتی ؟ اور پھر مجھے اس خدمت کا موقع کیونکر ملتا ؟"

مولانا کی اس صاف گوئی اور قدر شناسی کا خیر الدین پاشا پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مولانا کا احترام کرنے لگے۔ "اظہار الحق" ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی۔ "تائید حق برحمۃ اللہ" اس کا تاریخی نام ہے یہ ایک مقدمے اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

صدرِ اعظم کے حکم سے "اظہار الحق" کا ایک ترکی عالم نے عربی سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ سلطنتِ عثمانیہ کی جانب سے یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کئے گئے۔ جنہیں پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف کیا۔ مصر میں کئی بار یہ کتاب چھپی۔ مولانا کے پڑپوتے مولوی سلیم الدین مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کا مسودہ ضائع ہو گیا اور چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد بھائی راندیری نے بڑی محنت اور جانکاہی سے گجراتی زبان میں منتقل کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اظہار الحق کے انگریزی ترجمے کی اشاعت کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "لوگ جب تک یہ کتاب پڑھتے رہیں گے دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند رہے گی۔" حقیقت یہ ہے کہ رد نصاریٰ میں یہی ایک کتاب ایسی ہے جس کا معقول جواب آج تک بھی دنیا نہ دے سکی۔

قیامِ قسطنطنیہ کے زمانے میں اکثر علماء و فضلاء اور مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگ شاہی مہمان خانے میں جمع ہوتے تھے جن سے مولانا رحمت اللہ مذہبی اور سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے۔ یورپ کی سائنسی معلومات اور جدید تعلیم کے اثرات ترکی میں پہنچ چکے تھے۔ اسی کی روشنی میں مولانا نے بعثت اور نبوت، حشر و نشر اور نزول وحی وغیرہ کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ان تمام مسائل پر مشتمل ایک گرانقدر رسالہ "تنبیہات" کے نام سے مولانا نے تصنیف فرمایا اور خیر الدین پاشا تونسی صدرِ اعظم ترکی کے حکم سے چھپا۔

قسطنطنیہ سے واپس مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد آپ نے حرم شریف میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے آپ نے طلباء کو علم معقول سے آگاہ کرایا اور خاص طور پر ریاضی میں علم ہیئت کا درس جاری کیا۔ یہ علم حجاز کی سرزمین میں غیر معروف تھا اس کے علاوہ وہاں مستقل طور پر صرف کا درس بھی نہیں دیا جاتا تھا بلکہ نحو کے ساتھ ہی صرف کی ابتدائی تعلیم دیدی جاتی تھی۔ مولانا نے صرف کی تعلیم کو نحو سے الگ کیا۔ بہت جلد مولانا کو احساس ہوا کہ یہاں ایسے مدرسے کی اشد ضرورت ہے جو مرکزِ اسلام مکہ معظمہ

کی شان کے شایان ہو اور دنیا کی مختلف زبانیں جاننے والے علماء اس مدرسے میں درس دیں۔ اور ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو دینی اور دنیاوی ضروریات کا کفیل ہو۔

ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ نے زمین حرم میں حضرت عبداللہ ابن عباس رض کی مٹی ہوئی درسگاہ کے احیاء کا ارادہ کر لیا۔ مہاجرین کی اولاد اور اہلِ عرب کے بچوں کو تعلیم دینے اور دستکاری سکھانے کے لیے ایک صنعتی سکول کے قیام کا خاکہ ذہن میں رکھا۔ تاکہ یہ لوگ ابتدائی تعلیم پانے کے بعد بھکاری نہ بنیں۔ اور افلاس و تنگ دستی کی جنسِ سامانیوں کا شکار نہ ہوں اس اہم ضرورت کی طرف مولانا نے مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین اور مخیر حضرات کی توجہ مبذول کرائی اور متعدد نشستوں میں طے پایا کہ نواب فیض احمد خاں رئیس علی گڑھ کے سکونتی مکان میں مدرسہ کھولا جائے جو ہندوستانی مہاجرین میں مالی اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے یہ مدرسہ قائم کرنے اور تعلیمی کاموں کو چلانے کے لیے اپیل فرمائی۔

اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا اور تقریباً ایک سو چودہ افراد نے چندہ دینا قبول کیا۔ ان میں خود مولانا کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ، نواب فیض احمد خاں، دلی کے مشہور تاجر حاجی علی جان اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ ہندی خواتین نے بھی بڑی خوشی سے اس کارِ خیر میں مالی امداد دی اور آہستہ آہستہ مدرسے کا کام چل نکلا۔ ابتدائے زندگی سے مولانا رحمت اللہ نے ردِ نصاریٰ کا جو فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا، وہ ہمیشہ جاری رہا، چنانچہ مکے میں بھی اپنے اس فرض سے غافل نہ رہے حالانکہ آخر عمر میں قویٰ نہایت مضمحل ہو گئے تھے۔ اور بصارت بھی جا چکی تھی۔

مولانا کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی بہت بڑھی ہوئی تھی سلطان عبدالحمید خاں کے دورِ حکومت ہی میں انگریزوں نے حکومت ترکی سے عدن میں جہازوں کا کوئلہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ مانگی۔ مولانا کو اس بات کا علم ہوا، تو آپ نے سلطان کو ایک خط لکھا کہ بحری اعتبار سے عدن بڑی اہم جگہ ہے اگر آپ نے یہ جگہ انگریزوں کو دیدی تو اس کے نتائج نہایت خطرناک نکلیں گے۔ اور آہستہ آہستہ پورے عدن پر انگریز قبضہ کرے گا۔ اس کا اثر دوسرے ممالکِ اسلامیہ پر بھی پڑے گا۔ افسوس کہ اس مشورے پر سلطان نے توجہ نہ دی اور جگہ دے دی جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے انگریز مدت تک عدن پر قابض رہے اور عرب ممالک کے لیے بڑی پریشانی کا باعث بنے اور بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ مولانا رحمت اللہ اور حاجی امداد اللہ دونوں بڑے روحانی پیشوا تھے۔ ان کی دور رس نگاہیں وہ دیکھتی تھیں جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دونوں حضرات انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ اور ان کی بقا کسی صورت سے انہیں منظور نہ تھی۔ مولانا رحمت اللہ سے کانگرس میں شریک ہونے کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا انہوں نے اس کا جو جواب دیا وہ "مشیر قیصر" لکھنؤ کے مدیر نے جنوری ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں درج کر دیا۔

"حاجی نواب عمر علی خاں رئیس باسودہ نے "مشیر قیصر" مطبوعہ ۳۰ جنوری ۱۸۹۰ء میں مولانا رحمت اللہ مہاجر مقیم مکہ معظمہ کا ایک خط چھپایا ہے جو کانگرس کی بابت ہے۔ یہ خط نواب صاحب نے مولانا کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا کہ اول تو میں کانگرس کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں، تاہم اس کے اصول اگر اچھے بھی ہوں، تو بعض وجوہ سے مسلمانوں کے حق میں کانگرس کی شرکت مضر ہے۔"

جس زمانے میں مولانا نے مدرسے کے لیے چندے کی اپیل فرمائی تھی اسی زمانے میں کلکتے کی ایک مخیّر اور باہمت دین دار خاتون صولت النساء بیگم اپنی صاحبزادی اور داماد کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے آئیں۔ ان کی خواہش تھی کہ حرمین شریفین میں کوئی ایسا کام کر جائیں جو صدقۂ جاریہ کے طور پر قائم رہے ان کا ارادہ مکہ معظمہ میں ایک رباط (سرائے) تعمیر کرنے کا ہوا۔ بیگم کے داماد مولانا رحمت اللہ کے درس میں باقاعدگی سے آتے تھے جو حرم کے اندر ہوتا تھا۔ ایک روز انہوں نے مولانا سے اپنی خوش دامن کے اس ارادے کا ذکر کر کے مشورہ لیا۔ مولانا نے فرمایا "مکے میں سرائیں تو بہت ہیں البتہ مدرسہ کوئی نہیں، یہاں ایک مستقل مدرسے کی ضرورت ہے"۔ داماد نے اس مشورے کا ذکر بیگم صاحبہ سے کیا۔ دوسرے روز وہ خود مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور کہا کہ مجھے آپ کا مشورہ نہایت پسند آیا۔ اب یہ بتایئے کہ مدرسے کے لیے زمین کتنے میں آئے گی۔ اور دوسرے اخراجات کا تخمینہ کیا ہے۔ یہ ایک فوری صورت غیب سے پیدا ہو گئی اور چونکہ اللہ کو یہ عظیم کام مولانا سے لینا تھا اس لیے محلہ خندریسہ میں مدرسے کے لیے نہ صرف زمین خرید لی گئی بلکہ تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔ تعمیر کے دوران میں صولت النساء بھی آتی تھیں اور کام دیکھ کر تشریف لے جاتی تھیں۔

۱۸۷۴ء مطابق ۱۲۹۱ ہجری میں مدرسے کی عمارت مکمل ہوئی اور صولت النساء بیگم کے نام کی مناسبت سے اس کا نام مدرسہ صولتیہ رکھا گیا۔ اس اوّلین وسیع عمارت میں پانچ بڑے اور تین چھوٹے کمرے اور ایک بڑا صحن تھا۔ تکمیل کے بعد ۱۲ شعبان بدھ کے روز سب مدرسوں اور طالب علموں کو لایا گیا۔ ایک سال بعد نواب محمود علی خاں والی ریاست چھتاری نے سو روپیہ ماہانہ اس مدرسے کے لیے مقرر کیے۔ یکایک مولانا کے سامنے اس مدرسے کے آغاز ہی سے ایسی پریشانیاں آن کھڑی ہوئیں جن کا انہیں گمان بھی نہ تھا ایک پریشانی کا باعث غیر بنے اور دوسری پریشانیاں اپنوں نے پیدا کیں۔ انگریزی کونسل جدے میں تھا۔ جب اس نے سنا کہ مولانا رحمت اللہ نے مکے میں ایک مستقل دینی مدرسہ جاری کر دیا ہے۔ تو انگاروں پر لوٹنے لگا وہ جانتا تھا کہ مولانا نے ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے اور پادری فنڈر کو کس طرح منہ کی کھانی پڑی تھی۔ پھر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں بھی مولانا نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اور اب یہ مکے میں اپنی درسگاہ قائم کر کے انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈہ کریں گے اور باغیانہ تحریک کی بنیاد رکھیں گے۔ دوسری طرف مقامی ترکی حکام کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ مکے میں ہندوستانی ہاتھوں سے مدرسے کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے ایسا نہ ہو کہ یہ مدرسہ آئندہ بیرونی اقتدار اور اغیار کی مداخلت کا کسی وقت ذریعہ بن جائے۔ ترکوں کی یہ بدگمانی کسی حد تک درست تھی کیونکہ انہیں اپنے ملک میں غیر ملکی عیسائی مشنریوں کی تکلیف دہ حرکتوں کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کیا اور ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جو دامے درمے سخنے مولانا کی مدد پر آمادہ ہو رہے تھے۔ لیکن مولانا کے ارادے میں ایک لحظے کے لیے بھی تزلزل پیدا نہ ہوا۔ بلکہ وہ اور زیادہ ہمت سے ان دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ترکی حکام کے دلوں میں شک و شبے کے جو کانٹے اگ آئے تھے ایک ایک کر کے ختم ہونے لگے۔ اور مدرسہ صولتیہ

دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔

جس زمانے میں مدرسے کی عمارت بن کر تعمیر ہوئی اس زمانے تک مکے میں نہر زبیدہ کی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ کام بھی مولانا نے کرایا۔ خلیفہ ہارون الرشید عباسی کی محبوب بیوی ملکہ زبیدہ نے یہ نہر اپنے خرچ پر دائمی صدقۂ جاریہ کی نیت سے بنوائی تھی لیکن کئی صدیوں میں مرمت اور دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث بے حد خراب اور خستہ حالت میں تھی۔ اور اس میں پانی آنا بند ہو گیا تھا۔ دفعتاً غیب سے اس کی مرمت کا سامان پیدا ہوا۔ ہندوستان سے ایک درد مند اور صاحبِ دل مسلمان سیٹھ عبدالواحد عرف واحد سیٹھ حج کرنے مکہ معظمہ آئے اور مولانا نے ان سے نہر زبیدہ کی مرمت کے کام میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ ایک مجلسِ مشاورت مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوئی۔ اس میں طے پایا کہ نہر کی مرمت کرانے اور ترکی حکومت سے اجازت لینے کے لیے ایک بورڈ قائم کیا جائے۔ غرض یہ بورڈ بنا جس میں مہاجرین ہند کے ہر طبقے سے نمائندے لیے گئے اور صدارت کے لیے مولانا رحمت اللہ کا نام تجویز ہوا۔ لیکن مولانا نے اپنے شاگردِ رشید شیخ عبدالرحمن سراج مفتی احناف شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس بورڈ کا صدر مقرر کیا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس کام کی ذمہ داری لی۔ سیٹھ واحد نہر زبیدہ کے خزانچی اور تحویل دار بنائے گئے۔ اور یہ صدقۂ جاریہ ان بزرگوں کی کوششوں سے پھر جاری ہو گیا۔ نہر کی مرمت سے پہلے مکے میں پانی کی بڑی قلت تھی۔ مکانوں میں بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے یہ انتظام کیا جاتا تھا۔ کہ چھتوں کو پختہ بنوا کر تہہ خانوں اور سردابوں کی طرح زمین دوز درجے تعمیر کروا لیتے تھے تاکہ بارش کا تمام پانی چھتوں سے جمع ہو کر آتا رہے۔ پانی کا مخزن ابھی مدرسے میں تیار نہیں ہوا تھا۔ اور اس کی تعمیر کے لیے صولت النساء بیگم سے درخواست کی گئی تھی لیکن ان کے کلکتہ واپس جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے جانے میں ایک دن باقی رہ گیا۔ اگلے دن رخصت ہونے کے ارادے سے انہوں نے اپنا سامان بھی باندھ لیا کہ اسی شب خواب میں دیکھا کہ انہیں جنت الفردوس میں نہایت عالی شان مکان عطا ہوا ہے۔ مگر اس میں کوئی حمام یا پانی رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی بیگم صاحبہ نے پہلا کام یہ کیا کہ مولانا رحمت اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور مدرسے میں پانی کا مخزن بنانے کے لیے روپیہ پیش کیا۔ اس کے بعد تاحیات مدرسے کے لیے پچاس روپے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

مولانا کے سامنے مسلمانوں کے مذہبی حالات کا پورا پورا نقشہ تھا۔ اور انہیں اختلافات کی کشمکش سے نکلنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ صولتیہ کو بھی فروعی اختلافات کا اکھاڑہ بنانے سے باز رکھا۔ اور اس کے لیے تین اصول وضع فرمائے۔

اولاً:۔ قطعی طور پر سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن اور مدرس اور طالب علم کو بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

ثانیاً:۔ اخلاقی رموز اور مختلف فیہ مسائل سے کلی احتراز

ثالثاً:۔ تفریق اور گروہ بندی سے پرہیز۔

ان تینوں اصولوں پر مدرسے کے مہتمموں نے اپنے اپنے دور میں پورا عمل کیا۔ مدرسے کی تعمیر کے ٹھیک نصف صدی بعد جب مولانا محمد علی جوہر سرزمین حجاز میں پہنچے اور مدرسے کا معائنہ فرمایا، اس کی پچاس سالہ زندگی کا جائزہ لیا، تو آپ نے خوش ہو کر تحریر فرمایا:۔

"مدرسے کی خوش نصیبی اور مولانا رحمت اللہ مرحوم کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمرہ یہ ہے۔ کہ اس کے تمام مدرسین اور طلباء اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں۔ ان کے خیالات میں افراط و تفریط سے

نہ جدال و نزاع کا انہیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انہیں خیال ہے۔ الحمد للہ اس نازک اور فتنے کے وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے اور وہ اس مدرسے پر ہے۔"

اسی زمانے میں دولتِ عثمانیہ کی جانب سے عثمان نوری پاشا حجاز کے گورنر مقرر ہوئے۔ یہ خالص فوجی ذہن کے آدمی تھے۔ اور زیادہ سوچ بچار کی اپنے ذہن کو زحمت نہ دیتے تھے۔ اس لیے مفسدین اور فتنہ انگیز لوگوں کو موقع ملا اور انہوں نے مولانا اور مدرسہ صولتیہ کے خلاف طرح طرح کی بے بنیاد باتیں کر کے نوری پاشا کو بدظن کر دیا۔ گورنر کے کان میں پھونکا گیا کہ اس مدرسے کے پیچھے ایک زبردست غیر ملکی تحریک کام کر رہی ہے۔ جو آگے چل کر خلافت عثمانیہ کے لیے خطرناک ثابت ہوگی۔ نوری پاشا نے مولانا کو بار بار بلایا اور خوب جرح کی، حتیٰ کہ مولانا عاجز آگئے اور کسی ذریعے سے انہوں نے سلطان عبدالحمید خاں تک اس پریشانی کی اطلاع کرائی۔ دربار خلافت سے فوراً نوری پاشا کے نام حکم آیا کہ مولانا رحمت اللہ کو فوراً قسطنطنیہ روانہ کرو۔ نوری پاشا حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ بالآخر ۲۰ ربیع الاول ۱۳۰۱ ہجری ہفتے کے دن مغرب کے وقت مولانا مکے سے روانہ ہو کر جدے پہنچے اور وہاں سے بابو جہاز مصری میں سوار ہو کر پانچ دن بعد سویز میں آئے۔ اگلے دن ریل سے اسکندریہ گئے۔ آٹھ دن وہاں قیام کر کے پھر جہاز پر سوار ہوئے اور پانچ دن بعد استنبول پہنچے ادھر جہاز نے لنگر ڈالا، ادھر سلطان عبدالحمید خاں کے اے ڈی سی مصطفیٰ وہیں جہاز پر آئے۔ اور نہایت ادب و احترام سے ملے کہا کہ حضرت سلطان نے آپ کو بہت بہت سلام فرمایا ہے اور خاص اپنی کشتی آپ کے لیے بھیجی ہے۔ وہاں سے چل کر قصر شاہی سلطانی تک آئے، پھر کشتی سے اتر کر دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہوئے۔ اور محل سرائے سلطانی میں پہنچے اس کے بعد سلطان عبدالحمید کے مصاحبینِ خاص اور اعلیٰ عہدے دار مولانا کی ملاقات کو آنے شروع ہوئے یہ ملاقاتیں آٹھ دن تک جاری رہیں اور مولانا کے اعزاز و اکرام کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نویں دن مولانا رحمت اللہ جناب شیخ الاسلام احمد اسعد عریانی زادہ کی ملاقات کو خود تشریف لے گئے وہ بہت تعظیم سے پیش آئے اور فرمایا:۔

"حضرت سلطان نے میرے نام فرمان بھیجا ہے کہ مولانا کی اچھی تعظیم کیجیو کہ اب تک ایسا مہمانِ عزیز میرے پاس نہیں آیا ہے۔ سو اس کے موافق مجھے ضروری ہے کہ آپ کی تعظیم کروں۔"

تین چار دن بعد سلطان کے اے ڈی سی پھر مولانا کے پاس آئے اور کہا "حضرت سلطان کی مرضی یہ ہے کہ آپ اپنے اہل و عیال کو یہیں بلا لیں۔ موسم ربیع قریب آپہنچا ہے۔ اب مدت تک استنبول کی آب و ہوا اچھی رہے گی۔" مولانا نے نہایت نرم الفاظ میں اس حکم کی تعمیل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اگلے روز سلطان عبدالحمید خاں کی جیبِ خاص سے پانچ ہزار قرش صاغ ماہانہ وظیفہ مولانا کے لیے مقرر کیا گیا۔ (اس زمانے کے تقریباً اڑھائی ہزار روپے) اور دس ہزار قرش صاغ عطا فرمائے۔ اگلے دن کیشہ مفتاح کعبہ اور عقیق البحر اور سنگِ مقصود کی دو بیش قیمت تسبیح مولانا کو بھجوائیں، پھر سلطانی فرمان آیا کہ ہم نے آپ کو حرمین شریفین کا رتبۂ پایہ عطا کیا اس کا لباس بھی پہنچے گا۔ ۶ رجب جمعرات کے دن عصر کے بعد سرائے سلطانی کو جانا ہوا۔ مغرب کے بعد مولانا کی ملاقات سلطان عبدالحمید خاں سے ہوئی۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں: "غایت عنایت شاہانہ سے پیش آئے۔ مسند سے اٹھ کر ایک دو قدم بڑھ کر ہاتھ میرا قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑ کے فرمایا! "کثرت شغل کے سبب اب تک میں نے ملاقات نہیں کی تھی اور تاخیر کا سبب اس کے سوا دوسرا نہیں۔"

پھر ہم بیٹھ گئے۔ جب میں اُٹھا اور سامنے آیا، تُرکی آداب شاہی کے مطابق سلطان پھر دوبارہ کمال خوشی سے اٹھے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا "تمہارا حال سننے کا میں مشتاق تھا اسی لیے میں نے تم کو بلایا ہے اور فرصت میں میں اور ملاقات اچھی طرح کروں گا۔ اور کچھ دیر تک باتیں کروں گا۔" دونوں بار میں نے بھی دُعا اور شکریے کے کلمات کہے۔"

قسطنطنیہ کے قیام کے دوران میں مولانا رحمت اللہ کو سلطان عبدالحمید خاں نے متعدد بار شرفِ باریابی بخشا۔ اور مختلف مسائل اور واقعات پر گفتگو کی۔

مولانا نے مدرسہ صولتیہ کے بارے میں تفصیلات سے سلطان کو آگاہ کیا۔ اس نے بے مسرت کا اظہار کیا۔ اور مدرسے کو مستقل مالی امداد دینے کا خیال بھی ظاہر کیا۔ لیکن مولانا نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ یہ امداد قبول نہ کی جائے۔ لہٰذا انکار فرما دیا۔ جس روز مولانا ترکی سے رخصت ہو کر مکہ جانے والے تھے اس روز سلطان کی جانب سے چار معزز و محترم شخصیتیں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ایک مرصع تلوار انہیں پیش کی اور سلطان عبدالحمید خاں نے مولانا کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے، وہ دہرائے:۔

"ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے۔"

مولانا قسطنطنیہ سے مکہ واپس پہنچے تو وہی عثمان پاشا جو مخالفت میں پیش پیش تھے مولانا کے استقبال کے لیے جدے کی بندرگاہ پر آئے ہوئے تھے۔ اور بڑھ کر انہوں نے مولانا سے معانقہ کیا، اپنی غلطی پر نادم تھے اور معافی کی درخواست پیش کی۔ مولانا نے خندہ پیشانی سے انہیں معاف کر دیا۔ پھر عثمان پاشا آخر وقت تک مولانا کے جانثار اور خدمت گذار رہے۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے مولانا کی بے مثال استقامت، دینی حمیّت اور اپنے اعلیٰ مقصد سے لگن کا ثبوت ملتا ہے۔ صحن حرم میں بیرِ زمزم کے سامنے باب النبیؐ کے محاذ میں ایک خوبصورت عمارت کے اندر سلطانی کتب خانہ تھا۔ یہ عمارت حج کے دنوں میں حاجیوں کی تکلیف اور اقامتِ نماز میں رکاوٹ کا سبب بنتی تھی۔ گورنر حجاز عثمان نوری پاشا نے اس پریشانی کی طرف وزارتِ اوقاف استنبول کو توجہ دلائی۔ اور مشورہ دیا کہ اگر کتب خانے کی عمارت یہاں سے ہٹا دی جائے تو زائرین کعبہ کو بے حد سہولت ہو گی۔ وزارت اوقاف نے یہ مسئلہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے نوری پاشا کا مشورہ قبول فرمایا اور حکم دیا کہ کتب خانے کی عمارت منہدم کر دی جائے اور کتابیں کسی دوسری عمارت میں منتقل کر دی جائیں۔

فرمان سلطانی جاری ہوتے ہی کتب خانے کی عمارت گرا دی گئی اور ملبے کے بارے میں گورنر نے ارادہ کیا کہ اسے فروخت کر دیا جائے۔ مولانا رحمت اللہ نے جب یہ سنا کہ یہ ملبہ فروخت ہو گا تو بے چین ہو گئے اور جو ملبہ کئی سو برس تک جوارِ کعبہ اور صحن حرم کا ایک حصہ رہا ہو اسے لوگ خرید کر اپنے سکونتی مکانوں میں استعمال کریں گے۔ مولانا اسی وقت عثمان نوری پاشا کے پاس پہنچے اور ملبے کے بارے میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نوری پاشا کا ذہن بھی اس طرف نہیں گیا تھا۔ اب مولانا کی بات سنی تو احساس ہوا کہ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ گورنر نے پوچھا "اب سوال یہ ہے کہ آخر اس ملبے کا مصرف کیا ہو گا؟" مولانا نے فوراً جواب دیا "اس ملبے کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے مدرسہ صولتیہ سے ملحق ایک مسجد بنوا دی جائے۔ اس مسجد میں مدرسے کے طلبہ اور مدرسین وغیرہ نماز ادا کیا کریں گے۔ یہ تجویز نہ

صرف نوری پاشا بلکہ وزارت اوقافِ ترکیہ کو بھی بہت پسند آئی۔ اب ملبے کی قیمت کے تعین پر ردّ وکد شروع ہوئی۔ نوری پاشا چاہتا تھا کہ یہ ملبہ مولانا کو مسجد کے لیے مفت دیدیا جائے لیکن یہ بات اس کے اختیار میں نہ تھی، اس سلسلے میں وزارتِ اوقاف ہی کچھ کرنے کی مجاز ٹھہرائی گئی تھی چنانچہ نوری پاشا نے مولانا سے کہا "آپ فکر نہ کریں، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ وزارتِ اوقاف اس ملبے کی آپ سے قیمت نہ لے۔ میں آج ہی وزارت کو تفصیل سے مراسلہ لکھتا ہوں، لیکن مولانا بخوبی جانتے تھے کہ وزارت کے محکمے میں جو معاملات جاتے ہیں، ان کو طے ہونے میں کئی مہینے لگ جاتے ہیں اس عرصے میں یہ ملبہ صحنِ حرم سے اٹھوا کر بابِ ابراہیم کے سامنے شارعِ عام پر ڈلوا دیا جائے گا، اور اس کی بڑی بے حرمتی ہو گی چنانچہ انہوں نے فرمایا: "میں اس ملبے کا ڈیڑھ ہزار ریال ادا کر سکتا ہوں" نوری پاشا نے فوراً یہ قیمت منظور کر لی۔ مولانا اسی وقت مدرسے میں واپس آئے۔ خازن سے پوچھا: "مدرسے میں اس وقت کتنی رقم موجود ہے" اس نے عرض کیا: "پندرہ سو سے زیادہ ریال نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی مولانا نے خازن سے رقم طلب کی۔ اور دوبارہ گورنر کے پاس گئے، یہ رقم ادا کی اور کتب خانے کا تمام ملبہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لے جا کر اٹھوا لائے اور مدرسے کے صحن میں ڈالدیا۔ ملبہ اٹھانے میں دوسرے آدمیوں کے ساتھ مولانا نے بھی ایک مزدور کی طرح کام کیا۔ اِدھر تو مولانا نے یہ کارِ خیر کیا، اُدھر مدرسے کے بعض کمزور قلب اساتذہ اور طلباء میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ مہینہ ختم ہونے والا ہے مدرسین کو تنخواہیں اور طلبہ کو وظائف کہاں سے ادا کیے جائیں گے؟ اس کے علاوہ اور جو ضروری اخراجات ہیں وہ بغیر رقم کے کیسے پورے ہوں گے۔ مخالفین اور شرپسند لوگوں نے یہ باتیں سنیں تو بے حد خوش ہوئے کہ اب مدرسے میں خلفشار نمودار ہو گا۔ لیکن مولانا حسبِ معمول نہایت اطمینان و سکون سے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے تھے۔ اور ذرہ برابر بھی پریشانی انہیں اس معاملے میں نہ ہوئی۔

ابھی تیسرا دن بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ایک میمن تاجر جو اس زمانے میں ہندوستان سے مکہ معظمہ آیا ہوا تھا، مولانا سے ملاقات کے لیے مدرسے میں آیا۔ اس نے سنا تھا کہ مولانا اپنے مدرسے میں مسجد بنوانے کے لیے حرم شریف کے کُتب خانے کا ملبہ اٹھوا کر لے گئے ہیں۔ آتے ہی اس میمن تاجر نے دس ہزار ریال کی تھیلیاں مولانا کے قدموں میں رکھ دیں۔ اور عرض کیا حضرت آپ نے بڑا کام کیا خدا قبول فرمائے" مولانا کی آرزو تھی کہ مسجد کے تین گنبد بنوائیں۔ لیکن عرب میں ایسے گنبد بنوانا آسان نہ تھا۔ یہ کام وہی معمار کر سکتے تھے جو اس طرزِ تعمیر سے آگاہ ہوتے۔ یکایک پھر غیب سے مدد ہوئی۔ مسجد کی تعمیر کا کام جاری تھا کہ اسی سال حج کے لیے پانی پت سے دو اعلیٰ درجے کے معمار آئے اتفاق سے ان کی ملاقات حرم میں مولانا رحمت اللہ سے ہوئی۔ مولانا نے ان کے سامنے اپنی مشکل پیش کی۔ وہ دونوں مسجد دیکھنے آئے۔ اور مولانا سے عرض کیا کہ آپ فکر نہ کریں۔ تین گنبدوں والی مسجد ہم بنا دیں گے۔ چنانچہ مولانا مدرسے کے اساتذہ طلباء اور مہاجرین حرم نہایت ذوق شوق اور ولولے سے اینٹ گارہ اور پتھر اٹھا اٹھا کر ان معماروں کو دینے لگے اور یوں اس متبرک ملبے سے ۱۳۰۴ ہجری میں مدرسہ صولتیہ کی مسجد تیار ہوئی۔

مدرسہ صولتیہ مولانا رحمت اللہ کی وجہ سے ایک مرکزی مقام بن گیا تھا، حج کے زمانے میں ہندوستان سے جتنے بھی علماء، فضلاء

(باقی ۲۸ پر)

محمد احمد براق المصری



اصحاب الفیل

ترجمہ: عبدالصمد صارم الازہری

یمن کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ربیعہ بن نصر ہوا ہے جو بنی کہلان بن سبا کی اولاد سے تھا۔

اس کی بادشاہت کا زمانہ سدِّ مآرب کے منہدم ہو جانے کے بعد کا ہے جسے سبا بن یعرب بن قحطان نے بارش کا پانی روکنے اور سرزمین یمن سیراب کرنے کے لیے بنایا تھا اور جس سے سینکڑوں سال تک یہ سرزمین سیراب ہوتی رہی۔ پھر حکم الٰہی سے یہ سد گر گئی۔

سدِّ مآرب کے گرنے کے بعد یمنی قبیلے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کچھ یمن ہی میں رہے اور کچھ عرب کی زمینوں میں منتشر ہو گئے۔ ربیعہ بن نصر یمن کا بادشاہ بنا۔

ایک رات ربیعہ نے ایک خواب دیکھا جس سے وہ سخت خوف زدہ ہو گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا بیدار ہوا۔

اس رات بادشاہ کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا اور سخت بے قرار رہا۔ حتیٰ کہ جب صبح ہوئی تو اس نے شاہی محل کے آدمیوں کو بلایا اور ان سے کہا، جتنے بھی کاہن، نجومی اور تعبیر گو ہیں سب کو بلا لاؤ۔

فوراً تمام کاہن، نجومی اور معبّر آ گئے۔ شاہ نے ان سے کہا۔ کہ میں تم لوگوں سے آج کے خواب کی تعبیر مانگتا ہوں۔ جس نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے۔

وہ بولے: فرمائیے؟ آپ بیان کیجئے۔ ہم انشاء اللہ تعبیر دیں گے۔

بادشاہ نے کہا: اگر میں تم سے اپنا خواب بیان کر دوں گا اور پھر تم تعبیر دو گے تو مجھے اس تعبیر پر اطمینان نہیں ہو گا۔ میں تو اس کی بات سچی مانوں گا جو مجھے میرے خواب کی تعبیر بغیر میرے کچھ کہے دے دے۔

کاہن، نجومی اور معبّر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کیونکہ وہ کیسے ایسے خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں جسے وہ جانتے ہی نہیں۔

چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بالآخر ایک کاہن نے کہا:

اے بادشاہ! جو کچھ آپ چاہتے ہیں یہ کام تو صرف دو کاہن ہی کر سکتے ہیں ایک شق اور دوسرے سطیح۔ کیونکہ وہ دونوں سارے یمن میں سب سے بڑے عالم ہیں بلکہ روئے زمین پر سب سے بڑے عالم ہیں۔ وہی آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتے ہیں اور جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس کی تعبیر دے سکتے ہیں۔

بادشاہ نے کہا: تو شق اور سطیح کو بلاؤ۔

فوراً دونوں کے بلانے کا حکم صادر ہو گیا دونوں کی تلاش میں قاصد روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ قاصد سطیح کو لے آیا۔ وہ چھوٹے قد والا، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں والا، بٹے پیٹ اور سیدھے سینے اور سر والا تھا۔ اس کے چہرے کے نشانات تک واضح نہ تھے جب وہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو اس

نے کہا:

"مَیں نے آج رات ایک خواب دیکھا جس سے مَیں گھبرا گیا ہوں۔ مجھے بتا کہ مَیں نے کیا خواب دیکھا ہے اگر تو میرا خواب بتا دے گا تو مَیں امید کرتا ہوں کہ اس کی تعبیر بھی صحیح صحیح بتا دے گا۔

سطیح نے کہا۔ ہاں! مَیں آپ کو بتائے دیتا ہوں اے بادشاہ! آپ نے روشن چنگاریاں دیکھیں جو تاریک زمیں سے نکلیں اور تہمہ کی سرزمین میں جا گریں اور ہر چرند پرند نے انہیں کھایا۔

بادشاہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور کہا:۔

"اے سطیح! ہاں مَیں نے یہی خواب دیکھا تھا تو نے غلط نہیں کہا۔ اب بتا اس کی تعبیر کیا ہے؟

سطیح نے کہا۔ مَیں حرمین کے تمام سانپوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری سرزمین پر اہل حبش کا قبضہ ہو جائے گا اور وہ ابین سے لے کر جرش تک قابض ہو جائیں گے۔

بادشاہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔ اے سطیح! کیا ہمارے لیے یہ بات تکلیف دہ نہیں ہے۔ مجھے بتا ایسا کب ہوگا؟ آیا میرے زمانے میں یا میرے بعد؟

سطیح نے کہا۔ آپ کے کچھ بعد، کوئی ساٹھ ستّر سال بعد!

بادشاہ نے سطیح سے کہا۔ کیا یہ سلطنت اہلِ حبش میں رہے گی یا جلد ختم ہو جائے گی؟

سطیح نے کہا: نہیں بلکہ ختم ہو جائے گی کوئی ستّر سال بعد ختم ہو جائے گی۔ پھر وہ قتل کر دیے جائیں گی، اور یہاں سے بھاگ جائیں گے۔

بادشاہ نے پوچھا: انہیں کون قتل کرے گا اور کون نکالے گا؟

سطیح نے کہا: بنو یزن کا ایک لڑکا انہیں نکال دے گا جو عدن سے ان کے خلاف بغاوت کرے گا اور کسی بھی حبشی کو یمن میں نہیں چھوڑے گا۔

بادشاہ نے کہا: کیا اس کی سلطنت باقی رہے گی؟

سطیح نے کہا: نہیں بلکہ ختم ہو جائے گی۔

بادشاہ نے کہا: اُسے کون ختم کرے گا؟

سطیح نے کہا: ایک ذکی نبی جس کے پاس اللہ وحی بھیجے گا۔

بادشاہ نے کہا: یہ نبی کن لوگوں میں سے ہوگا؟

سطیح بولا: غالب بن فہر بن مالک بن النضر کی اولاد سے ہوگا۔ اور رہتی دنیا تک مملکت اس کی قوم میں رہے گی۔

تب بادشاہ نے کہا: کیا زمانہ کبھی ختم بھی ہوگا؟

سطیح بولا: ہاں جس دن سب جمع کیے جائیں گے۔ نیک سعادت مند ہوں گے اور بدبخت سزا پائیں گے۔

بادشاہ نے پوچھا: اے سطیح! تو جو کچھ کہہ رہا ہے کیا یہ سچ ہے؟

سطیح بولا۔ ہاں قسم ہے شفق اور تاریکی کی جو کچھ میں نے کہا۔ سچ ہے۔

پھر سطیح بادشاہ کے دربار سے واپس چلا آیا تاکہ شق کی باری آئے۔ شق بڑا دبلا پتلا بے ڈول سا انسان تھا۔ جیسے کسی آدمی کے دو ٹکڑے کر لیے گئے ہوں۔ بادشاہ نے اس سے بھی سطیح جیسے سوالات کیے اور اسے نہ اپنا خواب بتایا نہ سطیح کا جواب بتایا۔

شق نے کہا۔ اے بادشاہ! آپ نے اپنے خواب میں کوئلے تاریک زمین سے نکلتے دیکھے اور وہ کوئلے باغ، جھاڑیوں اور لوگوں کے درمیان آن پڑے۔

پھر کیا تھا بادشاہ حیران رہ گیا کہ کیسے دونوں نے ایک جیسی بات کہہ دی اور دونوں کے علم پر بڑی حیرانی کا اظہار کیا۔

پھر بادشاہ نے اس سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو اس نے بھی وہی بات کہی جو سطیح نے کہی تھی۔

بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ اس کا خواب سچا ہے اور اہل حبش ایک دن ضرور بحر قلزم کو عبور کر کے یمن کی طرف آئیں گے اور اس پر قبضہ کریں گے!

بادشاہ نے سوچا کہ کیا کیا جائے۔

اس نے سوچا۔ ابھی تو کاہنوں کے قول کے مطابق عرصہ دراز ہے۔ اور اگر وہ اس زمانے تک زندہ نہ رہا تو اس کا کوئی بیٹا پوتا تو زندہ رہے گا۔ حبشی اسے پکڑ کر ذلیل کریں گے تو اسے اپنی اولاد کے بچانے کی کیا تدبیر کرنی چاہیے؟

ربیعہ بن نصر کئی دن اور کئی رات آرام سے نہ بیٹھا۔ یہی سوچتا رہا کہ کیا تدبیر کرے جس سے اہلِ یمن حبشی حملے سے محفوظ رہیں؟

بالآخر اس نے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ اپنی اولاد کسی محفوظ جگہ پر آباد کر دے جہاں وہ آرام کی زندگی بسر کر سکیں۔

لہٰذا اس نے اپنے تمام اہلِ خانہ کو سامانِ سفر دیا اور عراق کی طرف روانہ کر دیا۔ اور ایران کے ایک بادشاہ شاپور بن خرداد کو ان کے بارے میں چٹھی لکھی۔ جب وہ شاپور کے پاس پہنچے۔ تو اس نے انہیں حیرہ (عراق) میں اقامت گزیں کیا۔

مرتے دم تک ربیعہ بن نصر یمن کا بادشاہ رہا۔ اس کے مرنے کے بعد مملکت حمیر بن سبا کی اولاد میں منتقل ہو گئی۔ کئی سال تک ان لوگوں میں سلطنت رہی حتیٰ کہ سلطنت کا مالک ایک فاسق و فاجر انسان لخنیعہ ذو شناتر ہو گیا۔ اس نے قوم پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کئے۔ اور بنو حمیر کے شاہی خاندان کو ذلیل کرنا شروع کیا۔ وہ اسی طرح لوگوں پر ظلم کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک نوجوان نے جو شاہی خاندان سے تھا۔ اسے ایک جرأت آمیز حیلے سے قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام زرعہ بن تبان تھا۔

زرعہ یمن کا مالک ہو گیا اسے ذو نواس کہتے تھے وہ یہودی تھا اور بڑا ہی متعصب تھا جو شخص یہودی نہ ہوتا وہ اس کا سخت دشمن بن جاتا۔

نجران جو کہ یمن کے شمال میں واقع تھا مسیحی مذہب کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ذو نواس کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر اہلِ نجران پر چڑھ گیا اور بہت ساری آگ دہکا کر کہا۔ یا دین سے پھر جاؤ ورنہ آگ کی نذر کر دئے جاؤ گے۔ ان میں سے اکثریت نے آگ میں جل جانا پسند کیا تو اس نے گڑھے کھدوائے اور ایندھن سے بھروا کر اس میں سب کو جلا دیا۔

ایک شخص کا نام دوس ذو ثعلبان مسیحی تھا وہ کسی طرح بھاگ کر حبشہ کے بادشاہ اور قیصرِ روم کے پاس پہنچا تاکہ ان سے مصیبت کے لیے امداد مانگے اور ذو نواس سے بدلہ لے۔

دوس ذی ثعلبان، بحرِ قلزم کو پار کر کے نجاشی حبشہ کے پاس پہنچ گیا۔ تاکہ ذو نواس کے مظالم کا اس سے حال بیان کرے اور بتائے کہ اہلِ نجران کی اکثریت دین سے نہیں پھری مگر آگ میں جلا دی گئی۔

نجاشی کو اس بات پر بہت غصہ آیا اور وہ ذو نواس شاہِ یمن سے سخت ناراض ہو گیا مگر وہ اس کے ساتھ کوئی لشکر نہ بھیج سکا۔ کیونکہ اس کے پاس اتنی کشتیاں نہ تھیں کہ وہ سمندر پار اپنی فوجیں بھیج سکتا۔ اس نے دوس ذی ثعلبان سے معذرت کی اور کہا کہ میں ذو نواس سے نہیں لڑ سکتا کیونکہ سخت مجبور ہوں۔

مگر دوس نے ہمت نہ ہاری اس نے بادشاہوں کو ذو نواس سے بدلہ لینے پر بھڑکایا اور شاہِ روم کے پاس پہنچا۔

قیصرِ روم نے دوس کی باتیں سنیں تو اسے سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے دوس سے کہا،

"میں تو یہ چاہتا ہوں اپنے لشکر تیرے ملک کی طرف بھیجوں لیکن جگہ بہت دور ہے۔ لہٰذا میں نجاشی شاہِ حبش کو چٹھی لکھے دیتا ہوں۔ وہ اپنے لشکر سے تیری مدد کریگا اور میں انہیں بقدرِ ضرورت کشتیاں دے دوں گا۔"

دوس نے قیصرِ روم کا شکریہ ادا کیا اور حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچا۔ تاکہ اپنی کوششوں کو بار آور کرے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دوس کی کوششیں بار آور ہو گئیں۔ اور حبش کا لشکر بحرِ قلزم کو عبور کرتا ہوا یمن کی طرف چلا۔ کیونکہ شاہ روم نے انہیں بہت سی کشتیاں دے دی تھیں۔

اہلِ یمن اور ذو نواس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے انہیں اس وقت پتہ چلا جب کہ حبشی لشکر ملکِ یمن کو تاخت و تاراج کر رہا تھا۔ یہ ٹڈی دل لشکر تھا اور ان کا سردار ایک بڑا لمبا کالا شخص تھا جس کا نام ارباط تھا۔

اہلِ یمن ڈر گئے۔ ذو نواس نے اپنے لشکر کو مدافعت کے لیے جمع کرنا شروع کیا۔ قبیلوں کے

سرداروں کو لشکر جمع کرنے کا حکم دیا اور خود لشکر لے کر مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔

مگر اس اچانک حملے کا اہلِ یمن پر بہت برا اثر پڑا۔ وہ پوری طرح تیاری نہ کر سکے لہٰذا یمنی لشکر بہت جلد شکست کھا گیا۔ اور وہ بہت جلد منتشر ہو گئے۔

ذونواس نے دیکھا کہ لشکر بھاگ گیا ہے تو اسے اپنا انجام معلوم ہو گیا۔ لہٰذا اس نے اپنے گھوڑے کو سمندر کی طرف ڈال دیا۔ اس کے سخت مہمیز لگائی۔ گھوڑا سمندر میں کود پڑا۔ ذونواس نے ایک ایڑ اور لگائی تو گھوڑا اور آگے بڑھا حتیٰ کہ ڈوب گیا۔ اس طرح ذونواس کی حکومت ختم ہو گئی جو بنی حمیر کا آخری بادشاہ تھا۔

ارباط اپنا لشکر لے کر یمن میں گھس گیا اور نجاشیِ حبشہ کے نام سے قابض ہو گیا اس نے وہاں کی بہت سی عمارتیں گرا دیں۔ بادشاہوں کے قلعے منہدم کر دیئے۔ غمدان کے قلعہ کو بھی گرا دیا۔ اور جو لوگ اس میں پناہ گزین تھے انہیں قید کر لیا۔ بنی حمیر کے شہزادوں اور سرداروں کو گرفتار کر لیا اور تہائی قیدی شاہ حبشہ کو بھیج دیے اس نے معاہدہ کیا تھا کہ اگر یمن پر قبضہ ہو گیا تو وہ تہائی قیدی شاہِ حبشہ کو ہدیہ دے گا۔

اس طرح اہلِ یمن کے ساتھ اہلِ حبشہ لڑے۔ ربیعہ بن نصر بادشاہ کا خواب سچا ہو کر رہا۔ اور شق اور سطیح کی پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی۔

ارباط عرصہ تک یمن پر سلطنت کرتا رہا۔ اہلِ یمن کو اس کے زمانۂ حکومت میں سخت ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ابرہہ بادشاہ کا دور آیا۔

ابرہہ، ارباط کے لشکروں کا سپہ سالار تھا اس کا ارباط سے جھگڑا ہو گیا۔ کچھ سرداروں نے اس کا ساتھ دیا اور اس طرح لشکر دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک گروہ ارباط کے ساتھ اور ایک ابرہہ کے ساتھ ہو گیا۔

اس اختلاف کا یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ کوئی ایک فریق غالب آئے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی سلطنت رہے۔

ایک گروہ دوسرے گروہ سے ٹکرایا۔ اب کسی ایک کی شکست لازم تھی۔ دونوں آمنے سامنے آئے اور دونوں لشکر ٹکرائے۔ ابرہہ نے ارباط کے پاس پیغام بھیجا کہ آپس میں ٹکرانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح تو حبشی لشکر ختم ہو جائے گا کیوں نہ ہم تم آپس میں لڑ لیں جس کی فتح ہو گی وہی یمن کا بادشاہ ہو جائیگا

ارباط نے کہا: ٹھیک ہے۔

ارباط بڑا لمبا چوڑا، کالا کلوٹا تھا اور ابرہہ چھوٹے سے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا تھا۔ دونوں سپہ سالار آمنے سامنے آئے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک خنجر تھا۔

ارباط کے پیچھے اس کا لشکر کھڑا تھا اور ابرہہ کے پیچھے اس کا لشکر تھا۔ دونوں نے اپنا اپنا خنجر سنبھالا۔ ارباط نے جو اپنا خنجر ابرہہ پر پھینک مارا تو وہ اس کی بھویں، آنکھ، ناک اور لب کاٹتا چلا گیا۔

ارباط کو یقین ہو گیا کہ اس کی فتح ہو گئی اور اب وہ یمن کے لشکر کا مالک ہو جائے گا کہ ابرہہ کے لشکر کے کسی آدمی نے ارباط پر خنجر پھینک مارا وہ اس کے دل کے پار ہو گیا اور وہ وہیں مر گیا۔ یہ خنجر ابرہہ کے غلام عتودہ نے مارا تھا جو اپنے آقا کی امداد کے لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

ابرہہ نے دیکھا کہ ارباط اس کے غلام کے خنجر سے زمین پر گر پڑا ہے اور غلام خوشی سے چلا اٹھا تھا۔ تو اس نے غلام سے کہا۔

اے عتودہ! اگر تو نے ارباط کو قتل کیا ہے تو ہم پر اس کی دیت لازم ہو گئی ہے تو نے میری بڑی خدمت کی مانگ جو کچھ مانگتا ہے؟

عتودہ نے کہا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اہلِ یمن کی اس وقت تک کوئی دلہن اپنے شوہر کے گھر نہ جائے جب تک کہ پہلے میرے پاس ایک رات نہ گزارے۔

ابرہہ کو یہ بات اگرچہ ناگوار گزری مگر اس نے

کہا: تو نے عجیب مطالبہ کیا ہے مگر میں تیرا مطالبہ مانتا ہوں۔

اریاط کا لشکر ابرہہ کے قبضہ میں آگیا۔ ابرہہ بڑا خوش ہوا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ سب میدان صاف ہوگیا ہے۔

مگر جب نجاشی کو اریاط کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بہت خفا ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک یمن کی سرزمین کو نہ روند ڈالونگا اور ابرہہ کی پیشانی کے بال نہ کاٹ دوں گا۔

ابرہہ کو پتہ چلا تو اس نے اپنے سارے بال کٹوا کر ایک لفافہ میں بھیجے اور اپنی انگلی کٹوا کر ایک بوتل خون سے بھر دی۔ اور ایک تھیلے میں یمن کی مٹی بھر دی۔ پھر ایک قاصد کے ہاتھ یہ تینوں چیزیں بھیج دیں اور ایک چٹھی میں لکھا:

"آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ اریاط آپ کا غلام تھا اور میں بھی آپ کا غلام ہوں، ہم دونوں ایک معاملہ میں مختلف ہوگئے۔ ہم دونوں آپ کے فرمانبردار تھے۔ مگر میں یمن پر غالب تھا اور اس کی سیاست کا مالک تھا۔ میں نے اپنا سر منڈا دیا ہے، اپنا خون بہا دیا ہے اور یمن کی مٹی آپ کی خدمت میں بھیج دی ہے تاکہ آپ اپنی قسم پوری کر لیں" اور اس مٹی کو اپنے قدموں سے روند ڈالیں۔

نجاشی، ابرہہ سے راضی ہوگیا اس کے حیلے اور سیاست پر وہ بہت خوش ہوا اور قاصد کے ذریعہ پیغام بھیجا۔

سرزمین یمن پر میرے دوسرے حکم کے پہنچنے تک حکومت کرتے رہو۔

اب ابرہہ کو یقین ہوگیا کہ فضا بالکل صاف ہو گئی۔ لہٰذا وہ اس طرح یمن پر حکومت کرنے لگا کہ نصرانیت اور اہل حبشہ کو اس کی حکومت سے فائدہ ہو۔

ابرہہ کا لقب اشرم پڑ گیا کیونکہ اس کا منہ اریاط کے خنجر سے کٹ چکا تھا (اشرم منہ کٹا) ابرہہ کو یہ شوق دامن گیر ہوا کہ یمن کی کسی حسین عورت سے شادی کرے۔ اسے معلوم ہوا کہ ریحانہ بنت ذی جدن جو ابی مرۃ بن ذی یزن کی بیوی ہے بڑی حسین و جمیلہ ہے لہٰذا اُسے اُس سے محبت ہوگئی اُس نے قاصد بھیجے اور وہ اسے اس کے باپ کے گھر سے نکال لائے۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ معدی کرب بن ابی مرۃ تھا۔ قصرِ شاہی میں اسے لائے تو ابرہہ نے اسے اپنی باندی بنا لیا۔

ابومرۃ جو کہ یمن کا سردار تھا اس واقعہ کے بعد صنعاء میں نہ رہ سکا۔ لہٰذا وہ یمن کے کسی شہر کی طرف کوچ کر گیا اور وہ ابرہہ اور شاہِ حبشہ کے خلاف لشکر جمع کرنے لگا۔ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ اس کا کیا انجام ہوا۔

ریحانہ ابرہہ کے محل میں اپنے حسین و جمیل شریف شوہر کو یاد کرتی رہی مگر اُس کے رونے دھونے سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔

ریحانہ کے ابرہہ سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مسروق رکھا گیا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بسباسہ رکھا گیا۔ ابرہہ کی حبشی بیوی سے بھی ایک لڑکا تھا جس کا نام یکسوم تھا۔ اسی کے نام پر ابرہہ کی کنیت ابویکسوم تھی۔

اس زمانے میں بھی عتودہ ابرہہ کا غلام تھا جس نے اریاط کو قتل کیا تھا۔

اہلِ یمن کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ جس لڑکی کی بھی شادی ہو پہلے وہ عتودہ کے پاس رہے لہٰذا انہوں نے ابرہہ کے حکم کی پرواہ نہ کی اور اسے قتل کر دیا۔

ابرہہ بڑا بُردبار انسان تھا اور بڑا سیاسی آدمی اُس نے عتودہ کے قتل پر اظہارِ ناراضی نہ کیا بلکہ اہل یمن سے کہا۔

"اے اہل یمن! میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم بڑے صاحبِ غیرت ہو۔ بخدا اگر معلوم ہوتا کہ عتودہ ایسی شرط پیش کرے گا تو میں ہرگز ایسا حکم نہ دیتا اور ہرگز اسے کوئی انعام نہ دیتا۔ اب جبکہ تم لوگوں نے اسے قتل کر دیا ہے تو میں تم سے کوئی مواخذہ نہیں کرتا اور نہ تم سے ناراض ہوں۔"

اسی طرح نہایت بردباری سے ابرہہ حکومت کرتا رہا۔ جہاں بردباری کا موقعہ ہوتا بردباری کرتا اور جہاں سختی کا موقعہ ہوتا سختی سے پیش آتا۔ ایسا وہ اکثر ایسے وقت کرتا جب کہ اس کا ذاتی مفاد یا اس کے ملک و مذہب کا کوئی مفاد ٹکراتا۔

ابرہہ نے دیکھا کہ اہلِ یمن سال کے سال جمع ہوتے ہیں، کھانے پینے کا سامان لیتے ہیں اور سفر کے لیے جاتے ہیں تو اس نے پوچھا:۔

"یہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟"

لوگوں نے کہا۔ مکہ، حج کے لیے جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا۔" وہ گھر کس چیز کا بنا ہوا ہے؟

لوگوں نے کہا۔" پتھر کا!"

اس نے پوچھا: کیا معمولی پتھر ہے یا اس پر کوئی غلاف وغیرہ چڑھا ہوا ہے؟

لوگوں نے کہا: سادہ پتھر کی عمارت ہے۔ اور اس پر یمنی غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ یہ غلاف ہر سال جاتا ہے جب سے کہ یمن کے ایک بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ اس کے لیے ہر سال غلاف جایا کرے۔ تبّان اسعد ابو کرب نے خواب میں دیکھا تھا کہ کعبہ پر غلاف چڑھائے۔ اس زمانے سے برابر یہ غلاف یمن سے جاتا ہے۔

ابرہہ نے اس معاملہ میں غور کیا پھر بولا:

"قسم ہے حضرت مسیح کی! میں تمہارے لئے اس سے بہتر گھر تعمیر کروں گا۔"

ابرہہ کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی وہ رات دن اسی فکر میں رہتا کہ کسی طرح اہل عرب اور اہلِ یمن کو اس گھر کے حج سے روک دے۔

لہٰذا اس نے قیصرِ روم کو لکھا کہ وہ صنعاء میں ایک ایسا گرجا گھر تعمیر کرانا چاہتا ہے جس کا تذکرہ تاریخوں میں رہے۔ قیصر نے اس کی مدد کے لیے انجنیئر، معمار اور سامانِ تعمیر بھیجا اور سنگِ مرمر وغیرہ قیمتی پتھر بطور تحفہ کے بھیجے۔

مزدوروں نے بڑی محنت سے تعمیر شروع کر دی۔ اور انجنیئروں نے خوب اپنی مہارت صرف کی۔ اس گھر کے ستون بڑے خوبصورت پتھروں سے بنائے گئے تھے سونے کی صلیبیں گاڑی گئیں۔ سنگِ مرمر کا فرش کیا گیا، چھتوں پر پچی کاری کی گئی۔ دیواروں پر سونے کا پانی پھیرا گیا اور شاہانِ یمن کے قلعوں کے جواہرات سے مزین کیا گیا۔ ان جواہرات میں ایک ایسا نادر گوہر بھی تھا جو ملکۂ سبا بلقیس کے تخت میں لگا ہوا تھا۔ اس پتھر کی بڑی شہرت تھی اور شاہانِ یمن اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ یہ پتھر قلیس گرجا میں لگا دیا گیا۔ جسے ابرہہ نے بنایا تھا۔

ابرہہ کی مراد بر آئی قلیس گرجا بن گیا۔ اس جیسا کنیسہ سطحِ زمین پر کہیں بھی نہیں تھا۔

ابرہہ نے شاہِ حبشہ کو چٹھی لکھی کہ میں نے آپ کے لیے ایک عجیب و غریب گرجا بنایا ہے کہ اس جیسا سرزمین پر آج تک نہیں بنایا گیا۔ میں تمام اہلِ عرب کو اس کے حج کرنے پر مجبور کروں گا۔

ابرہہ کی اس چٹھی کا تمام عرب میں چرچا ہو گیا لہٰذا وہ سخت ناراض ہوئے۔

بنی کنانہ کے ایک شخص نے تو یہ حرکت کی کہ وہ یمن پہنچا اور رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہوا، پاخانہ پھرا اور اس کی محراب پر لگا دیا۔ پھر صبح ہوتے ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔

صبح ہوتے گرجا والوں نے عربی کی یہ حرکت دیکھی تو ابرہہ کو بتایا وہ بہت غضب ناک ہوا اور اس نے حکم دیا کہ پاخانہ پھرنے والے کا پتہ لگایا جائے۔

معلوم ہوا کہ یہ حرکت بنی کنانہ کے ایک شخص نے کی ہے کیونکہ جب اسے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ ابرہہ اہلِ عرب کو مکہ کے حج سے روک دے گا تو اس نے قسم کھائی کہ اس گھر کو نجاست سے بھر دے گا۔ وہ شخص کہتا ہے کہ یہ گھر حج کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ابرہہ کو جو یہ معلوم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

اس نے کہا۔ کیا میں نے یہ نادر کنیسہ جیسے موتیوں

اور جواہرات سے آراستہ کیا ہے اور بڑا روپیہ صرف کیا ہے۔ اس لیے بنایا ہے کہ یہاں ایک بدّو آ کر پاخانہ پھر دے۔ جہاں میں مشک اور عنبر جلواتا ہوں اور بہت سے نگران حفاظت کے لیے رکھتا ہوں۔ بدّو کی یہ ہمت کہ وہ اس گھر کا مذاق اڑائے اور لوگوں کو اس گھر سے برگشتہ کرے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا!

ابرہہ نے اعلان کروا دیا کہ کوئی بھی سوائے اس گرجا کے کہیں حج کے لیے نہیں جا سکتا۔ اور کوئی اس گھر کے علاوہ کہیں بھی زیارت کے لیے نہیں جا سکتا۔

پھر اس نے اہلِ کنانہ کے پاس اپنا ایک حاکم بھیجا۔ جس کا نام محمد بن خزاعی تھا کہ بنو کنانہ کنیسہ قلیس میں حج کرنے کے لیے آئیں۔

بنی کنانہ نے ایک شخص مروہ بن قباص سے کہا۔ کہ اسے قتل کر دے اس نے اس کے تیر مارا اور وہ مر گیا۔

اب ابرہہ صبر نہ کر سکا لہٰذا اس نے اعلان کر دیا۔ کہ میں بیت اللہ کو گرا کر ہی دم لوں گا۔ جہاں اہل عرب حج کے لیے جاتے ہیں۔

پھر اس نے شاہِ حبشہ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ میرے لئے اپنے ہاتھی محمود کو بھیج دو تاکہ میں فتح پا سکوں۔

نجاشی نے اسے لکھا، جو چاہے کر تجھے اختیار ہے۔

نجاشی نے اپنا مخصوص ہاتھی جس کا نام محمود تھا۔ ابرہہ کے لیے بھیج دیا اور بھی بہت سے جنگ آزمودہ ہاتھی بھیجے۔

ابرہہ نے مکّہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے حبشیوں کا ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور انہیں ہر طرح کے سامان سے لیس کیا۔

ابرہہ سپاہ سالارِ لشکر بن کر چلا وہ محمود پر سوار تھا تاکہ مکہ کے بیت اللہ کو گرا دے۔

مگر عذابِ الٰہی نازل ہوا اور وہ سب کے سب مارے گئے۔

بقیہ: رئیس المجاہدین

صوفیا اور مشائخ مکہ معظمہ حاضر ہوتے، ہمیشہ اس مدرسے میں تشریف لایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ مولانا رحمت اللہ کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اور ابھی تک جاری ہے۔ چنانچہ ان مشاہیر میں سے مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد حسین الٰہ آبادی، علی برادران اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی شامل ہیں۔

مولانا کی قوت بصارت ۱۳۰۵ ہجری ہی میں زائل ہو چکی تھی اور بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے آپریشن کے لیے سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر آپ نے قسطنطنیہ کا تیسرا سفر بھی کیا، لیکن بعض وجوہ سے آپریشن کرانے پر رضامند نہ ہوئے اور واپس مکے آ گئے۔ اس نقاہت اور بیماری کے عالم میں بھی دن رات مدرسہ صولتیہ کے کاموں میں مصروف رہتے۔ چنانچہ ایک برس شدید بیمار رہ کر ۸۵ سال کی عمر میں ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ کو واصل الی الحق ہوئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آپ کی تاریخ وفات "غریب الوطن" سے برامد ہوتی ہے۔

ماخوذ:۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند۔ غدرِ دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ مراۃ الیقین۔ تذکرہ الرشید۔ خاتم سلیمانی۔ مہر منیر۔ فیض احمد بدایونی۔

عبادت کا مغز

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (ترمذی)

دین کا مغز یہ ہے کہ ہر مصیبت میں صرف اللہ کو پکارا جائے۔

دین کا یہ مغز ہے اے دوستو!
غیر سے تم التجائیں چھوڑ دو!

احیاء العلوم سے انتخاب

تحقیق : الامام محمد بن محمد الغزالی
ترجمہ و تلخیص : زاہد الراشدی

عِلم اور اُس کے تقاضے

عالم کون ؟

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کوئی شخص اس وقت تک عالم نہیں ہو سکتا جب تک اپنے علم پر عمل نہ کرے۔

علم کی دو قسمیں

جناب رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم وہ ہے جو صرف زبان پر ہے۔ یہ علم انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے اور دوسرا علم وہ ہے جو دل میں ہے اور یہی علم نافع ہے۔

علم کا مقصد

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علم اس ارادے سے حاصل نہ کرو کہ اس علم کے ساتھ دوسرے علماء پر فخر جتا سکو یا بے وقوفوں پر علم کی دھاک بٹھا سکو یا لوگوں کی توجہ اس علم کی وجہ سے اپنی طرف مبذول کرا سکو کیونکہ جس نے اس مقصد کے لیے علم حاصل کیا وہ جہنم میں جائے گا۔

دجّال سے زیادہ فتنہ خیز

جناب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں تم پر دجّال سے زیادہ کچھ دوسرے لوگوں کی فتنہ خیزیوں کا زیادہ خوف رکھتا ہوں پوچھا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! وہ کون لوگ ہیں ؟ فرمایا گمراہ کرنے والے امام۔

علم بغیر ہدایت

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے علم میں ترقی کی لیکن ہدایت میں ترقی نہ کی اس نے اللہ تعالیٰ سے دُور ہونے میں ترقی کی۔

آگ کی لگام

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اس علم کو چھپایا جو اس کے پاس ہے اسے قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

علماء سُوء کی مثال

حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا علماء سُوء کی مثال ایسی ہے جیسے نہر کے راستہ میں پتھر کی چٹان کھڑی ہو جائے جو نہ تو خود پانی پیتی ہے اور نہ پانی کو کھیتوں تک پہنچنے کے لیے راستہ دیتی ہے۔

لذّتِ دعاء سے محروم

حضرت داؤد علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کوئی عالم میری محبت پر اپنی خواہشات کو غالب کر لیتا ہے تو میں اسے کم از کم جو سزا دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسے دعاء اور مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔

عالم نہیں ڈاکو

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ اے داؤد علیہ السلام ! میرے بارے میں کسی ایسے عالم سے راہ نمائی نہ لینا جسے دنیا نے مدہوش کر رکھا ہے کیونکہ وہ آپ کو میری محبت سے دُور ہٹا دے گا اور ایسے لوگ میرے بندوں کو لُوٹنے والے ڈاکو ہیں۔

صاحب علم منافق

امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے اس امت میں سب سے زیادہ صاحب علم منافق کی فتنہ خیزی کا خوف ہے۔ لوگوں نے پوچھا حضرت! یہ فرمائیے کہ صاحب علم منافق کون ہے؟ فرمایا زبان کا علم رکھنے والا اور دل اور علم کا جاہل۔

بے وقوف کی راہ

حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ اے مخاطب! تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو علماء کا علم اور حکماء کے نادر نکات جمع کرتے ہیں لیکن عمل کے میدان میں بے وقوفوں کی راہ پر چلتے ہیں۔

سب سے زیادہ ندامت

حضرت ابراہیم بن عیینہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ ندامت اٹھانے والا کون ہوگا؟ فرمایا دنیا میں وہ شخص زیادہ ندامت اٹھاتا ہے جو کسی ناشکر گزار کے ساتھ نیکی کرے اور موت کے وقت حد سے تجاوز کرنے والے عالم کو سب سے زیادہ ندامت ہوگی۔

علم کا کوچ

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ علم انسان کو عمل پر ابھارتا ہے اگر وہ اس پر عمل کرلے تو فبہا ورنہ علم کوچ کر جاتا ہے۔

علم اور جہل

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ عالم اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک وہ علم حاصل کرتا ہے اور جب وہ یہ گمان کرنے لگے کہ وہ عالم ہو گیا ہے تو وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے۔

دنیا کا کھیل

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے تین آدمیوں پر بہت رحم آتا ہے (۱) قوم کا سردار جب ذلیل ہو جائے (۲) قوم کا مالدار شخص جب محتاج ہو جائے اور (۳) وہ عالم جس کے ساتھ دنیا کی خواہشات کھیلنے لگیں۔

دل کی موت

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ علماء کی سزا دل کا مردہ ہو جانا ہے۔ اور دل مردہ اس وقت ہوتا ہے جب آخرت کے عمل سے کوئی شخص دنیا حاصل کرنے لگے۔

علم کی زینت

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب کوئی شخص علم و حکمت کو حصول دنیا کا ذریعہ بنالے تو علم اور حکمت کی زینت اس سے غائب ہو جاتی ہے۔

بقیہ: شذرہ

حکومت (۹) اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کی بساط ابھی تک بچھی ہوئی ہے اور آخری نتائج ہنوز پردہ غیب میں ہیں۔

ان حالات میں شرافت کا رویہ اپنانا اور زیادہ ضروری ہے لیکن مقام تاسف ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا —— ہم ان حادثہ کی پیداوار وزراء کرام سے گزارش کریں گے کہ ظلم اور زیادتی اتنی کرو جس کا حساب چکانا تمہارے لیے آسان ہو؟

مذاکرات

خیال تھا کہ اس ہفتہ مذاکرات مکمل ہو جائیں گے۔ نتائج سامنے آجائیں گے تو ان پر اظہار خیال کیا جائے گا لیکن شاید ابھی کچھ اور دن انتظار کرنا پڑے۔ اس لیے اس مسئلہ کو آئندہ ہفتہ پر چھوڑتے ہیں۔

بارگاہ ربوبیت میں دست بدعا ہیں کہ اے اللہ! انہیں اپنے نیک مقاصد میں کامیاب فرما۔

تقریظ و تنقید

فیضانِ رحمت :

۴۸ صفحات کا یہ خوبصورت رسالہ حافظ الحدیث والقرآن حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی زید مجدھم کے افادات پر مشتمل ہے۔ جس کو حضرت کے ایک فیض یافتہ جناب محمد منظور الوجیدی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں مختلف اوراد و وظائف نقل کئے گئے ہیں جو حضرت کے معمولات اور منقولات پر مشتمل ہیں اور حضرت کی طرف سے ان کی عام اجازت ہے۔

دعا ارشادات نبوت کے مطابق عبادت کا مغز ہے — دکھے دلوں کا سہارا ہے۔ قضاء حاجات کے لیے ایک موثر ہتھیار ہے لیکن اس کے لیے صحیح رہنمائی ازبس ضروری ہے اور حافظ الحدیث زید مجدھم جیسے صاحب علم و نظر اور شیخ کامل سے بڑھ کر صحیح رہنمائی کون کرے گا؟

بلاشبہ حضرت والا کا وجود باجود اس دور میں اللہ تعالیٰ کے فیضانِ خاص کا مظہر ہے۔ خلقِ خدا سے آپ کو جو تعلق ہے اور ان کی بہبود کے لیے آپ اس عمر میں بھی جس طرح مصروف جہد و عمل رہتے ہیں محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بہرحال فاضل مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک شیخ وقت کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ شافی نسخے مریضانِ روحانی و جسمانی کے لیے یکجا کر دیے ہیں۔

سفید کاغذ، واضح اور کھلی کتابت، ستھری طباعت — قیمت صرف ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ الیوم ۱۹۔مین بازار مزنگ لاہور

مسلمان کون ہے؟

ہم سب اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں لیکن ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جنہیں معلوم نہیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ اور اس حقیقت سے ناواقف ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

اسلام کو جاننا اور کم از کم اتنا جاننا کہ آدمی حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کر سکے ازبس ضروری ہے۔ اسی طرح آدمی اس دنیا میں کامیاب و بامراد زندگی گزار سکتا ہے۔ اور اسی برتے پر آخرت میں سرخروئی کی امید رکھنی چاہیے۔

مولانا محمد منظور الوجیدی لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن اس ذوق کو وہ خدمتِ اسلام و مسلمین کے لیے وقف کر چکے ہیں ورنہ جلب منفعت اور حصول زر مقصد ہو تو میدان بڑا وسیع ہے۔

اُن کے اس شوق کی واضح علامت زیر تبصرہ کتاب ہے جو سوا پانچ سو کے قریب صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت سب گوارا اور مناسب ہیں۔

اس کتاب کے چار ابواب اور ۴۶۳ ذیلی عنوانات ہیں عقائد سے لے کر تصوف تک انفرادی زندگی کے معاملات سے اجتماعی حیات کے لوازمات تک موصوف نے سیدھی سادی زبان میں وہ باتیں نقل کر دی ہیں جن کا جاننا ماننا اور جن پر عمل کرنا مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

اس موضوع پر لٹریچر ملے گا اور ضرور۔ لیکن اس طرح آسان زبان میں شاید کوئی چیز دستیاب ہو سکے۔ بنا بریں ہماری خواہش و سفارش ہے کہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ مسلمانوں کا ہر فرد اس کو پڑھ کر اپنا جائزہ لے لے کہ میں کس درجہ کا مسلمان ہوں؟

پندرہ روپے میں مکتبہ الیوم مین بازار مزنگ لاہور سے طلب فرمائیں۔

(علوی)

ضروری اعلان

جمعیۃ علماء اسلام شہر شکارپور کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب (آف پشاوری) کے صاحبزادے امداد اللہ گزشتہ چند یوم سے لاپتہ ہیں۔ عمر تقریباً بارہ سال ہے وہ دارالقرآۃ شکارپور میں زیر تعلیم تھے اگر کسی صاحب کو معلوم ہو تو درج ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں۔

۱۔ عبدالباری شیخ کمن گیٹ نزد مسجد حنفیہ شکارپور

۲۔ مدرسہ اشرفیہ محلہ دین پور، شکارپور سندھ

مفتی محمود

ہری پور میں

جمعیۃ علماء اسلام کے قائد اور پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمود زید مجدہم تحریک آزادی برصغیر کے نامور رہنما حکیم عبدالسلام کی وفات کے موقع پر اور اس کے بعد ایک عرصہ تک نظر بندی اور دوسری مجبوریوں کے پیش نظر ہری پور تشریف نہ لا سکے۔ اب ۹/۲۴ ۲۲ کو آپ کچھ وقت نکال کر پنڈی سے ہری پور تشریف لائے۔ مرحوم کی رہائش گاہ پر حکیم صاحب کے فرزند اور جمعیۃ علماء اسلام کے رہنما حکیم عبدالرشید انور ان کے برادران اور دوسرے متعلقین سے اظہار ہمدردی کیا۔ بعد میں شیرانوالہ گیٹ ہری پور کی مسجد میں ایک عظیم تعزیتی جلسے سے خطاب فرمایا۔ جس میں آپ نے مرحوم حکیم صاحب کی قومی اور ملی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ وہ ہمیشہ باطل قوتوں سے نبرد آزما رہے اور کبھی بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم کی شمع کردہ مشعل ہمیشہ فروزاں رہیگی اور ہم اس ملک کو ان عظیم لوگوں کی آرزوؤں کے مطابق اسلامی نظام کا گہوارہ بنائیں گے۔

(رپورٹ پرویز اختر صدر جمعیۃ طلباء اسلام ہری پور)

کپتان غلام محمدؒ انتقال کر گئے

علاقہ سون ضلع سرگودھا کے قصبہ انگہ کے کپتان غلام محمد جو مولانا گل شیر شہید اور حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے۔ تحریک خلافت سے لے کر آج تک مختلف تحریکوں میں مرحوم نے نہایت خلوص کے ساتھ حصّہ لیا۔

مرزا محمود قادیانی نے تحصیل خوشاب کی اس پُر بہار وادی میں جب نخلہ بنا کر مسلمانوں کو مرتد بنانے کی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنایا۔ تو کپتان غلام محمد ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حضرت امیر شریعت کے حکم پر علاقہ میں مرزائیت کی بیخ کنی کے لیے بھرپور کام کیا۔ یہاں تک کہ ان مخلص ورکروں اور مجلس تحفظ ختم نبوت کی کوششوں کی وجہ سے مرزائیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علاقہ کو چھوڑ گئی۔ مرکزیہ مجلس تحفظ ختم نبوّت ملتان کی سرپرستی میں نخلہ کے قریب مدرسہ تعلیم القرآن جس کے لیے علاقہ جابہ کے ایک مخیر مسلمان نے زمین دی تھی اور اب وہاں تعمیر شروع ہے اس میں مرحوم غلام محمد آج کل کام کر رہے تھے۔ اس مشن پر چلتے چلتے انہوں نے اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔

قارئین خدام الدین سے دعا کی درخواست ہے۔

عزیز الرحمٰن خورشید جامع مسجد نور، بھیرہ

• عبدالرحمٰن محمد عبداللہ کے برادر محمد ابراہیم قضاء الٰہی سے فوت ہو گئے ہیں قارئین کرام سے دعا کی درخواست ہے۔

مولانا عبیداللہ انور پبلشر نے پرنٹر خواجہ شوکت علی پریمیئر پرنٹرز میں چھپوا کر شیرانوالہ گیٹ لاہور سے شائع کیا۔